۱۹۸۱ء

معارف رضا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

معارفِ رضاء

مُرتّبین

محمّد اطہر نعیمی، سیّد محمّد ریاست علی قادری

بہ اہتمام

سیّد شاہ تُرابُ الحق قادری
مدیر رضا ایشیا

ناشر

ادارۂ معارفِ رضاء

۳۷ بی/۱۱ سی I نارتھ ناظم آباد کراچی

مجلہ ——— معارف رضا

مرتبین ——— مولانا محمد اطہر نعیمی، سید محمد ریاست علی قادری بریلوی

کتابت ——— حافظ محمود احمد ناشر

مطبع کا نام ——— نفیس اکیڈمی

ناشر ——— ادارہ معارف رضا نارتھ کراچی

سنہ طباعت ——— صفر ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء ۱۹۸۵ء

اشاعت و تعداد ——— اول ایک ہزار

قیمت ——— ۵ روپیے

تعاون ——— مولانا شاہ تراب الحق

ادارہ معارف رضا

۳۷، بی ۱۱ سی ۱، نارتھ کراچی

وقف لائبریری
ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان (رجسٹرڈ)

۱۔ اداریہ	
۲۔ فتاویٰ رضویہ کا فقہی مقام	جناب شمس صاحب بریلوی
۳۔ جدید و قدیم سائنسی افکار و نظریات اور امام احمد رضا	پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
۴۔ اعلیٰحضرت کی نعتیہ شعر و شاعری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب
۵۔ رسالہ در علم لوگارثم کے چند حواشی پر تحقیقی مقالہ	پروفیسر محمد ابرار حسین صاحب
۶۔ امام احمد رضا کا معراج نامہ	مرزا نظام الدین بیگ جامؔ صاحب
۷۔ خطۂ خراساں کی خوش بختی	مولانا ظاہر شاہ صاحب ۔ سوات
۸۔ منقبت اعلیٰحضرت	وجاہت رسول صاحب قادری
۹۔ فاضل بریلوی کے معاشی نکات	پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی
۱۰۔ فاضل بریلوی اور چند یادداشتیں	مولانا محمد اطہر نعیمی
۱۱۔ امام احمد رضا کا شخصی جائزہ	ڈاکٹر مختار الدین آرزو
۱۲۔ امام احمد رضا ایشیا کا عظیم محقق	مولانا عبد الکریم (بنگلہ دیش)
۱۳۔ ایک عظیم سائنسدان	سید محمد ریاست علی قادری
۱۴۔ امام احمد رضا کا ایک نادر فتویٰ	(بشکریہ) پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
۱۵۔ فتاویٰ رضویہ کے زیر طبع صفحہ کا عکس	" جناب مولانا شاہ تراب الحق قادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ناظرین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادارہ معارفِ رضا گذشتہ ماہ عالمِ وجود میں آیا ہے اور اس کے چند مخلص اراکین کی اولین کوشش آپ کے سامنے ہے۔ اس کوشش میں ہم نے کتنی کامیابی حاصل کی؟ اسکا فیصلہ آپ پر ہے۔ اگر ہم نے قابلِ قدر کامیابی حاصل کی ہے تو ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں اور اگر ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس میں کچھ خامیاں ہوں تو ان کی نشاندہی فرمائیں۔ تاکہ ہم آئندہ اصلاح کر سکیں۔

ادارہ معارفِ رضا نے اس مجلہ کو اس جذبے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ برصغیر کی اس عظیم المرتبت شخصیت جسکو دنیائے علم وفضل اعلیٰحضرت مجدد دین وملت مولانا شاہ محمد احمد رضا خان صاحب، فاضل بریلوی قدس سرہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کے علمی وعملی کارناموں کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے۔ ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ماضی میں ایسی نابغہ روزگار شخصیت جنکی تصنیفات کی تعداد ایک ہزار سے متجاوز ہے اب تک ان کے بارے میں کوئی شایانِ شان کام منصہ شہود پر نہیں آیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ موصوف کی تصنیفات کی اکثریت ابتک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ اور بقول بعض الماریوں میں پڑی ہوئی ہے۔

ادارہ نے کوشش یہ کی ہے کہ اس مجلہ میں فاضل بریلوی قدس سرہ کی ذاتِ اقدس کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے کیلیے اہلِ علم حضرات کی ان تلمی کاوشوں کو پیش کیا جائے جو ناظرین کیلیئے مزید معلومات کا سبب بن سکیں۔ زیرِ نظر مجلہ میں ملک کے مشہور اہلِ علم و قلم حضرات کی کاوشیں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ان حضرات نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ اپنی جگہ انفرادیت کے حامل ہیں۔

محترم جناب شمس الحسن صاحب شمس بریلوی نے فاضل بریلوی قدس سرہ کے نادرِ روزگار مجموعہ فتاویٰ پر ایک طویل وبسیط مقالہ تحریر فرمایا تھا لیکن تنگیٔ داماں نے اراکینِ ادارہ کو مجبور کیا اور فاضل مقالہ نگار سے یہ درخواست کرنی پڑی کہ موصوف اس مقالہ کی تلخیص فرما دیں تاکہ اسکو شریکِ اشاعت کیا جا سکے۔ اراکینِ ادارہ اپنے سرپرست جناب شمس بریلوی صاحب کا ممنون ہے کہ انہوں نے دوبارہ کاوش فرما کر اس کی تلخیص فرمائی۔ اس مقالہ کے بارے میں تعارفی کلمات لکھنا تحصیلِ حاصل ہے۔

مکرمی جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب استاد جامعہ کراچی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ موصوف نے فاضل بریلوی قدس سرہ کی شاعری کے بارے میں مضمون عطا فرمایا۔ مضمون کی افادیت کے سلسلہ میں تبصرہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ادارہ ڈاکٹر صاحب کی اس عنایت کا مشکور ہے

نا سپاسی ہوگی اگر محترمی ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کے اس تعاون کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جو موصوف نے ادارہ ہذا کے ساتھ فرمایا ہے۔ ان کے مشورے ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے اور ہمارے لیے راہِ عمل متعین کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فاضل بریلوی قدس سرہ کے علمی وعملی کارناموں کو اجاگر کرنے میں جو کام ڈاکٹر صاحب موصوف نے سرانجام دیا ہے وہ منفرد ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جناب

ڈاکٹر صاحب نے فاضل بریلوی قدس سرہٗ کی شخصیت کے بارے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اب تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ اس سلسلہ میں محترمی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری مرکزی مجلسِ رضا کے روحِ رواں بھی قابلِ صد مبارک باد ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں پورا پورا تعاون کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کر کے بلا قیمت ناظرین تک پہنچایا ہے۔

اس مجلہ میں فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے معرکۃ الآراء قصیدہ معراجیہ پر محترمی جناب نظام الدین بیگ صاحب ایم اے کے ایک بصیرت افروز مقالہ کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنی مجبوریوں کی وجہ سے مکمل مقالہ پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن قارئین کرام کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ یہ مکمل مقالہ زیرِ طبع ہے۔

ہم ان دوسرے اہلِ قلم حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنکی قلمی معاونت ہمارے شاملِ حال رہی اور ان کے مضامین اس مجلہ میں شامل کیے جا سکے۔ ہمیں یہاں اپنے معاون ادارہ الوفاق الصوفیاء کے ارکین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنکے تعاون اور مفید مشوروں نے ہر قدم پر ہماری معاونت اور رہبری کی۔

ادارہ معارفِ رضا کے ارکین اپنے ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنہوں نے اس ادارہ کی تشکیل سے قبل ہمیں اس بات کیلیے مجبور کیا کہ جلد از جلد اس ادارہ کی تشکیل کیجائے لیکن جب ہمیں ان کے عملی تعاون کی ضرورت ہوئی تو . . . . لیکن ہمیں ان مخلصین سے کوئی شکایت نہیں بلکہ ہم ان کے اس طرزِ عمل پر انتہائی شکر گزار ہیں کہ ان کے اس طریقِ کار کی وجہ سے ہمیں اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہوا۔

ناظرینِ کرام :-

ہم یہاں اس بات کا اظہار کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ہم نے اس مجلہ کی تیاری میں اخراجات کے لیے چندہ نہیں کیا بلکہ ہماری کوشش یہ تھی کہ ہم اس کے اخراجات اشتہارات سے پورے کریں لیکن اس میں ہمیں کما حقہ کامیابی نہ ہوئی البتہ چند ایسے اہلِ دل اور مخلص حضرات نے ہمارا تعاون فرمایا جو اپنے نام بھی منظرِ عام پر لانا گوارہ نہیں فرماتے۔ ہمیں ان حضرات کا اور ان کے علاوہ جن حضرات نے ادارہ پر بھروسہ کر کے اپنے اشتہارات عطا فرمائے۔ تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان کے لیے دعاگو ہیں۔

ہمیں محترمی جناب سید شاہ تراب الحق صاحب (چیرمین تعلیمی کمیٹی کراچی میونسپل کارپوریشن) جناب وجاہت رسول صاحب قادری۔ جناب ایچ۔ آر۔ اے خان صاحب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا ہے کہ ان حضرات نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون فرمایا ہے اور ہماری توقعات سے بڑھ کر ہماری امداد فرمائی ہے۔

ہم اپنے تمام معاونین کے تہہ دل سے مشکور ہیں اور خلوصِ قلب کے ساتھ ان کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور دین و دنیا کی نعمتوں سے نوازے۔ آمین۔ بجاہ سید المرسلین۔

آپ کے مخلص :-

محمد اطہر النعیمی ۔ سید محمد ریاست علی قادری

وارکینِ ادارہ معارفِ رضا
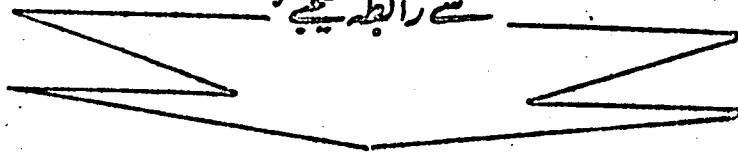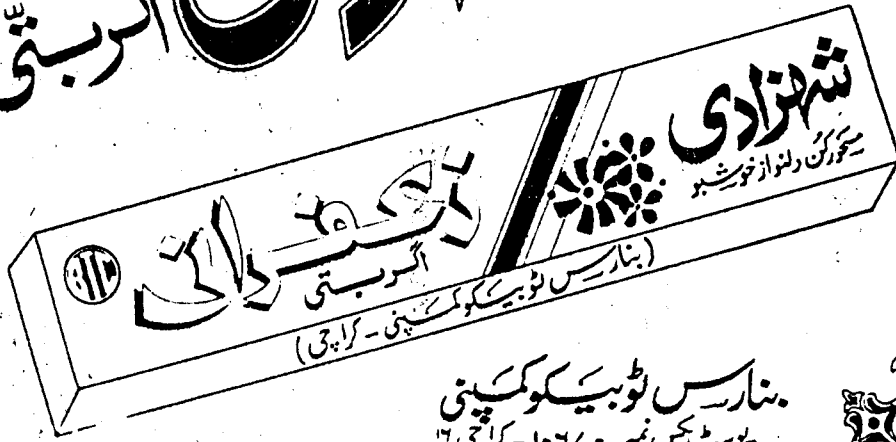
شہزادی اگربتی
بنارس ٹوبیکو کمپنی کراچی
خوشبوؤں کی شہزادی
شہزادی اگربتی
شہزادی
مسحور کن دلنواز خوشبو
شہزادی
اگربتی
(بنارس ٹوبیکو کمپنی - کراچی)
بنارس ٹوبیکو کمپنی
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۷۰ - کراچی ۱۶

فتاویٰ رضویہ کا فقہی مقام

از: شمس بریلوی

جناب شمس الحسن صاحب شمس بریلوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں نظم و نثر پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ آپ کی ترجمہ کردہ کتابیں مقبول خاص و عام ہیں۔ جناب شمس بریلوی صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ تراجم کے ساتھ بسیط و ضخیم مقدمات لکھنا جناب شمس صاحب کے ہی حصہ میں آیا ہے۔ تاریخ الخلفاء، عوارف المعارف پر مقدمات اسکا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

جناب شمس بریلوی صاحب نے اپنے علمی کارناموں میں ایک قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ وہ کلامِ رضا کا تحقیقی جائزہ ہے۔ موصوف نے فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے دیوان حدائقِ بخشش پر نہ صرف ایک بسیط مقالہ جو ڈھائی سو صفحات سے زیادہ پر محیط ہے تحریر فرمایا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی دیوان کی ترتیبِ نو فرمائی۔ اس میں حمد، نعت، مناقبت و رباعیات کو علیحدہ علیحدہ کر کے حدائقِ بخشش کی شاعرانہ انداز میں تدوین کی۔ اور اس کام میں اولیت حاصل کی۔

کلامِ رضا کے تحقیقی جائزہ کے سلسلہ پر صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں "مشک آنست کہ خود ببوید"، نیز یہاں تعارف ممکن نہیں۔ اگر جناب شمس صاحب نے حسبِ وعدہ فتاویٰ رضویہ پر اپنا مفصل مقالہ تحریر فرمایا تو اس کی اشاعت کے ساتھ کلامِ رضا کا مفصل تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ —— محمد اطہر نعیمی۔

الحمد للہ کہ برِصغیر پاک و ہند میں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جو مذہبِ حنفیہ کے پیرو اور مقلد ہیں۔ صرف پاکستان ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیشتر ممالک اسلامیہ جیسے افغانستان، عراق، شام، اردن، لبنان، مصر، ترکی اور بنگلہ دیش میں فقہ حنفیہ کی اتباع کرنے والے مسلمان آباد ہیں۔ اور ان کی ایسی اکثریت ہے کہ دوسرے فقہی مذاہب کے متبعین ایک ایسی اقلیت میں ہیں کہ جو کوئی امتیازی حیثیت کی حامل نہیں۔ اب سے چند صدی پہلے کے مشہور خانوادہ ہائے سلاطین جیسے عباسیہ، خوارزم شاہیہ، سلجوقیہ، غزنویہ ان سب خانوادہ ہائے شاہی کا فقہ مذہب حنفی تھا۔

زوالِ بغداد کے بعد جب ترک یا عثمانی اقتدار کو سنبھالنے کا موقع ملا تو سلطنت عثمانیہ کے سلاطین اور ان کی رعیت بھی فقہ حنفیہ پر گامزن تھی۔ صفوی سلطنت کے قیام سے پہلے ایران کے سلاطین تیموریہ، غزنویہ، سلجوقیہ اور خوارزم شاہیہ نے بڑی شان سے حکومت کی۔ اور تمام سرزمینِ ایران میں فقہ حنفیہ کا سکہ چل رہا تھا۔ آج حالت یہ ہے کہ تہران میں اہلِ سنت و جماعت کی صرف ایک مسجد ہے جس کی امامت اور خطابت کے فرائض ایک حنبلی بزرگ انجام دیتے ہیں۔ سلاطینِ غزنویہ کو فقہ حنفیہ سے اس قدر تعلق خاطر تھا کہ سلطان محمود غزنوی (انار اللہ برہانہ) نے خود

فقہ حنفیہ پر ایک کتاب تصنیف کی جسکا نام "کتاب التفرید" ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مذہبِ حنفیہ قبولیت کی کس منزل پر تھا۔

ہندوستان میں تیموری (مغلیہ) سلاطین کی آمد سے پہلے اسلامی ہند میں خلجی، تغلق، سلاطینِ دہلی (خاندانِ سادات) اور خاندانِ لودہی کے دورہائے سلطنت میں بھی مسلمان عوام اور حکومتِ وقت کا مذہب بھی فقہ حنفی تھا۔ جب مغلیہ سلطنت کی بنیاد شہنشاہ بابر کے ہاتھوں پڑی اسوقت سے آجتک برصغیر پاک و ہند میں الحمدللہ مسلمانوں یعنی سوادِ اعظم کا فقہی مذہب یہی ہے۔ البتہ ہند کے بعض ساحلی علاقوں میں شافعی مسلک کے متبعین بھی موجود ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں دورِ اکبری سیاسی اعتبار سے جتنا تابناک دور ہے اتنا ہی مذہبی اعتبار سے انحطاط پذیر دور کہا جاسکتا ہے لیکن علمائے احناف سے یہ دور بھی خالی نہیں تھا۔ اور مذہبِ حنفیہ اس دور میں بھی جاری و ساری تھا۔ دار السلطنت آگرہ اور اس کے بعد شاہجہانی دور میں دلّی علمائے احناف کا مرکز تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دورِ شاہجہانی سیاسی امن و سکون کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ترویج کا ایک زرّین دَور ہے۔ شاہجہانی دور کے علمائے احناف میں مقتدائے اہلِ سنّت محدّث علامہ حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی گلِ سرسبز ہیں۔ احیاءِ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے فروغ و اشاعت میں آپ کی مساعی ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ کے علاوہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی (ہرچند کہ آپ کا شمار علمائے معقولات میں کیا جاتا ہے) علامۂ دوراں منشی سعداللہ خان، مولانا عبدالسّلام فنِ تفسیر و فقہ میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ آخرالذکر مفتی لشکرِ شاہی کے جلیل القدر منصب پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں ملا عوض وجیہ، علامہ مولوی یعقوب لاہوری، یگانۂ روزگار حضرات تھے۔ (مولانا یعقوب صاحب لاہوری وہی صاحبِ ایمان و انصاف بزرگ ہیں جنہوں نے اورنگ زیب کے اصرار کے باوجود شہزادہ دارالشکوہ کے محضرِ الحاد پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا)۔

شاہجہاں کے بعد اورنگ زیب کا عہدِ معدلت آگیں پر نظر ڈالیئے۔ تمام ہندوستان سلطان باتدبیر کے حکمتِ عملی سے زیرِ نگین آگیا تھا۔ اس دور میں فقہ حنفیہ کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اسی دور میں مولانا (ملّا) جیون امیٹھوی کی قیادت و سرکردگی میں فقہ حنفیہ کا ایک شاہکار مجموعہ مدوّن ہوا۔ جو فتاویٰ ہندیہ یا فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور و معروف ہے لیکن قارئین کرام کے ذہنوں سے اس مغالطہ کو دور کرنا ضروری ہے کہ اسلامی ہند میں فتاویٰ عالمگیری کو اولیّت کا شرف حاصل ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شرف سلطان فیروز تغلق کو عطا فرمایا تھا۔ کہ اس سلطانِ ذیشان کے عہد میں صوبہ بہار کے سپہ سالار (تاتار خان) کی ہمت افزائی سے اس دور کے ایک علامہ اور فقیہ حضرت مولانا علامہ ابنِ علاء علاؤالدین نے فتاویٰ حنفیہ کا ایک ضخیم مجموعہ (جو چار جلدوں پر مشتمل ہے) مدوّن فرمایا اور تتار خان کے نام سے اسکو معنون کیا۔ یہ وہی فتاویٰ تتارخانیہ ہے جو مابعد کے فقہا کے لیئے سند و مفتی بہ رہا ہے۔ آپ فقہ حنفیہ یا فتاویٰ حنفیہ کی کوئی کتاب ایسی موجود نہیں پائیں گے جو عہدِ فیروزی کے بعد مدوّن و مرتّب ہوئی ہو اور اس میں فتاویٰ تتارخانیہ کا حوالہ موجود نہ ہو۔ ایک بات بیان اور عرض کرتا چلوں کہ فتاویٰ ہندیہ کی تدوین ایک مجلسِ فقہا (اکاڈیمی) کی زیرِ نگرانی ہوئی جسکے سربراہ ملا احمد جیون تھے۔ اور اس مجلس میں تقریباً چالیس علمائے کرام و مفتیانِ عظام تھے جو اس کی تدوین میں مشغول تھے۔ اور فتاویٰ تتارخانیہ صرف ایک عالم کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے بعض تلامذہ یا رفقاء سے بھی اس سلسلہ میں اعانت حاصل کی ہو۔ لیکن ایسی صراحت کہیں

موجود نہیں ہے۔ جبکہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں فقہائے وقت
کا اشتراکِ عمل تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فتاویٰ تاتارخانیہ کو عوام میں وہ
شہرت نہ حاصل ہو سکی جو فتاویٰ ہندیہ کو حاصل ہوئی۔ حکومتِ وقت
کی مالی اعانت سے کئی سال کی شبانہ روز کاوشوں سے فقہ حنفیہ
کی تمام کتب ظاہر الروایت و نوادر اور دوسری مستند کتابوں سے
مسائل کی تخریج و جزئیات کے بعد بحث و جرح کے بعد مسائل فقہیہ
کی تبویب کے ساتھ مرتب کیا گیا۔ فتاویٰ ہندیہ کی جامعیت کے
باعث اسکا شہرہ صرف ہند تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام ممالک اسلامیہ
میں اس کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور آج بھی اسکو اسی
طرح معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ اور بلادِ اسلامیہ میں فقہ
حنفی کا شاید ہی کوئی ایسا دارالافتاء ہو جہاں تخریجِ مسائل میں
اس سے استفادہ نہ کیا جاتا ہو۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ملک میں طوائف
الملوکی نے جگہ لے لی اور فرزندانِ اورنگ زیب عالمگیر باپ کی
وصیت کے مطابق تقسیم مملکت پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔
اور ایک دوسرے کا خون ہی بہانا پسند کیا۔ عہدِ عالمگیری کی
تاریخ دہرائی گئی اور شہزادوں نے بہت جلد اس بارگراں
سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ جو عالمگیر نے ان کے ناتواں کاندھوں
پر رکھدیا تھا۔ بہت جلد حکومتِ عالمگیری کے حدود سمٹنا شروع
ہوئے، جاٹوں، سکھوں اور راجپوتوں نے مسلمانوں پر جو مظالم
ڈھائے ان کو یہاں کیا دہراؤں۔ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیے
نوبت یہاں تک پہنچی کہ اٹھارویں صدی کے وسط کے عہد کی دھائی
میں سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی آخری شمع
کس مپرسی کے عالم میں رنگون میں بجھ گئی۔

اس دورِ اختلال ذہنی میں کیسے اتنا ہوش تھا کہ
علوم اسلامیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں روغن ڈالتا اور اس
کی فکر کرتا۔ وہ تو یہ کہیے کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور
ان کے نامور فرزندوں نے علومِ اسلامیہ کی لاج رکھ لی۔ شاہ صاحب
کی تصانیف اسلامی ہند میں اسلامی علوم کی چراغ مردہ کی آخری
لو تھی۔ جو ایک بارگی تیزی سے بھڑکی اور پھر چراغ بجھ گیا۔ شاہ
ولی اللہ قدس سرہٗ کے ترجمہ قرآن، اصولِ تفسیر و اصولِ حدیث اور
آپ کی مشہورِ زمانہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ اس سلسلہ میں قابلِ ذکر
ہیں۔ شاہ صاحب کے فرزندوں میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر
نے بھی قرآنِ حکیم کے اردو ترجمے کیے۔ آپ کے نامور فرزندِ گرامی
قدر شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تفسیرِ عزیزی لکھ کر ایک بڑا کام کیا۔
تفسیرِ عزیزی اس وقت کی علمی اور ادبی زبان فارسی میں ہے۔ اس
وقت دلی مسلمانوں کا ایک مرکزی مقام تھا مسلمانانِ ہند اپنے
ضروریاتِ دینی اور متفرقہ مسائل شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی
خدمت میں پیش کرتے۔ اور دور دراز کے ہندوستانی لوگ بذریعہ
مراسلات استفسار کرتے۔ شاہ صاحب جواب دیتے وہ ارسال ہوتے
فتاویٰ عزیزیہ انہی کے فتوؤں کا مجموعہ ہے۔ (جو فارسی زبان میں تھا
اور اسکا اردو ترجمہ کیا گیا ہے) شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہ فتاویٰ
ان کے اجتہاد پر مبنی نہیں ہیں۔ کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوئے
مدت گزر چکی تھی۔ اب تو صرف دوسرے مذاہبِ فقہی (شافعی
مالکی، حنبلی) کی طرح فقہ حنفی کی کتب ظاہر الروایت اور
نوادر ہی منتہی تھیں۔ انہیں سے تفحص و تلاش کے بعد فتویٰ
دیا جاتا تھا۔ فقہ حنفیہ کی مشہور کتب ظاہر الروایت میں جو کتب
بہت زیادہ مشہور ہیں اور آج تک قرنوں سے نقل در نقل اور
اب طبع ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہیں۔ ان کے ذکر سے پہلے
میں یہاں مناسب خیال کرتا ہوں کہ ظاہر الروایت اور مسائل النوادر
کی تشریح کروں کہ آئندہ جب یہ لفظ استعمال ہوں تو قاری
کے فہم پر بار نہ گزریں۔

حضرتِ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے جو قول
فقہیہ و مسائل دینی اور معاملات دنیوی، ہم تک پہنچے ہیں وہ آپ کے

تلامذۂ گرامی کے ذریعے سے پہنچے ہیں۔ خود امام صاحب قدس سرّہٗ کی تصنیفِ لطیف فقہ میں ایک رسالہ ہے جو "الفقہ الاکبر" کے نام سے موسوم ہے یہ ایک کم ضخامت و حجم کا رسالہ ہے اور علامہ ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) نے اس رسالہ کی شرح لکھی ہے اور اسکا متن اس شرح کے ساتھ مصر میں طبع ہوا۔ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں چار شاگرد ایسے ہیں جن پر فقہ حنفیہ نازاں ہے اور جنکی مساعی سے فقہ حنفیہ کا گرانبہا خزانہ آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہیں حضرت امام ابویوسف۔ (یعقوب ابن ابراہیم م ۱۸۲ھ) امام زفر ابن ہذیل (م ۱۵۸ھ) امام محمد حسن بن فرقد شیبانی اور امام حسن بن زیاد (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) ان چاروں حضرات میں امام ابویوسف اور امام محمد دنیائے فقہ میں "صاحبین" کے معزز لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انہی چاروں ائمہ کے ذریعہ حنفی مذہب دنیا میں پھیلا اور حنفی مسلک میں تصنیف و تالیف کا خزانہ ان کی بدولت اور ان کی مساعی سے معمور ہوا۔ اگر یہ حضرات امام اعظم رضی اللہ عنہ کے اقوال کو منضبط نہ کرتے تو فقہ حنفیہ اس بلندی پر نہ ہوتا۔

امام اعظم رضی اللہ عنہ کے یہ اقوال کس طرح منضبط ہوئے اسکا مختصر حال بھی مطالعہ فرما لیجیے۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ نے تدوینِ فقہ کا یہ اہم کام ۱۲۱ھ سے شروع کیا۔ آپ نے اپنے تلامذہ میں سے چالیس حضرات منتخب فرما کر ایک مجلس "لتفقہ فی الدین" قائم کی۔ اس مجلس میں امام ابویوسف۔ امام زفر۔ امام محمد خواجہ داؤد طائی۔ شیخ فضیل بن عیاض (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) جیسے مشاہیر و اکابر شامل تھے۔ ان حضرات کے علاوہ جو اور افراد تھے وہ بھی ایسے اربابِ فطانت، ذکاوت اور صاحبان فضل و کمال تھے جنکی مسائلِ دینی اور اجتہاد میں بہت گہری نظر تھی۔ ان چالیس حضرات میں تمام حضرات تفسیر و حدیث اور آثار، علوم عربیہ اور لغتِ عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ اس مجلس میں تدوینِ مسائل کا یہ طریقہ تھا کہ ایک مسئلہ پیش کیا جاتا۔ اگر مجلس کے تمام افراد ایک رائے پر متفق ہوتے تو اس کو معرضِ تحریر میں اسی وقت لے آتے تھے۔ ورنہ بصورتِ اختلاف اس پر آزادانہ بحث و تمحیص ہوتی۔ اربابِ مجلس اپنی رائے پیش کرتے۔ امام صاحب ان تمام آرائے مختلفہ کو سنکر فیصلہ صادر فرماتے اور اس فیصلہ کو تحریر کر لیا جاتا۔ اسی طرح ۱۵۰ھ تک یہ مجلس تدوینِ فقہ قائم رہی اور اس تیس سال کی مدت میں جرح، تحقیق اور اجتہاد کے بعد فقہ کا ایک عظیم الشان ذخیرہ مرتب ہوا۔ امام موفقؒ تحریر کرتے ہیں کہ امام اعظم نے تراسی ہزار مسئلے املا کرائے۔ جن میں اڑتیس ہزار عبادات میں اور پینتالیس ہزار معاملات میں ہیں۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر تلامذہ میں امام محمد اور امام ابویوسف نے مسائلِ فقہی کی ایسی توضیح و تشریح کی کہ امام صاحب کے اصل مجموعہ کی بھی ضرورت باقی نہ رہی کہ ان توضیحات و تشریحات کی اصل امام صاحب کے اقوال اور فیصلے ہی تو تھے۔ اسطرح اصل ماخذ اسقدر قابلِ اعتنا نہ رہا کہ جسقدر آپ کے تلامذہ کی تالیفات۔ امام محمد اور امام ابویوسف (رحمۃ اللہ علیہما) کی یہ توضیحات و تشریحات آج تمام دنیا میں موجود ہیں۔ اور یہی فقہ حنفیہ کا ماخذ و مدار ہیں۔ ان دونوں حضرات یعنی صاحبین کے علاوہ اور بہت سے فاضل و مشاہیر فقہاء نے مذہبِ حنفیہ پر ایک گرانقدر سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اور ان حضرات کی کتب بھی فقہ حنفیہ میں مفتیٰ بہ ہیں۔ البتہ یہ کہنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ مذہبِ حنفیہ پر تالیفات میں عظیم ترین حصہ امام محمد کا ہے۔ امام محمد (بن حسن شیبانی) نے فقہ حنفیہ پر جو کتابیں تالیف کی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جنکا نام بحیثیتِ مجموعی کتب ظاہر الروایۃ ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہیں

جنکو کتاب النوادر کہتے ہیں۔ فقہ حنفیہ میں کتب ظاہر الروایۃ یہ چھ ہیں۔

"المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر، کتاب السیر الکبیر، کتاب السیر الصغیر، اور زیادات۔"

ان چھ کتابوں کو علامہ شیخ ابوالفضل مروزی رح نے اپنی تصنیف "الکافی" میں جمع کیا ہے۔ فقہ حنفیہ کے مسائل کی زیادہ تر تخریج کتب الروایۃ سے کیجاتی ہے۔ کتب نوادر میں کتاب امالی محمد کیسانیات (شعیب کیسانی نے اس کی روایت کی ہے) "کتاب الرقیات، معارونیات، جرجانیات، اور کتاب المخارج فی الحیل ہے۔ کتب نوادر میں حضرت امام اعظم کی کتاب "المجرد" بھی شامل ہے جس کی روایت آپ کے شاگرد امام حسن بن زیاد لولوی نے کی ہے۔ کتاب الآثار بھی محمد بن حسن لولوی کی ہے۔

صاحبین اور امام حسن بن زیاد کے بعد فقہ حنفیہ کے مدونین و مؤلفین میں علامہ احمد بن مہر المعروف بہ خصاف (م ۲۶۱ھ) بھی قابل ذکر ہیں۔ آپ کی تالیفات میں کتاب الحیل اور کتاب الوقف بہت مشہور ہیں۔ علامہ خصاف کے بعد امام ابو جعفر طحاوی (م ۳۲۲ھ) ہیں جو کتاب جامع الکبیر فی الشروط کے مؤلف ہیں اور فقہ حنفیہ کے اولین مؤلفین کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ائمہ مذکور اور دوسرے فقہائے حنفیہ کے بعد وہ طبقہ پیدا ہوا جو مجتہد نہیں بلکہ فقہ حنفیہ کے مقلد اور مؤید تھے۔ ان اصحاب میں شیخ ابوالحسن کرخی (م ۳۴۰ھ) امام ابوعبداللہ جرجانی (م ۳۹۵ھ) قابل ذکر ہیں۔ امام ابوعبداللہ جرجانی فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب "خزانۃ الاکمل" کے مؤلف ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے مشہور مؤلفین فقہ حنفیہ میں احمد بن محمد قدوری ہیں۔ آپ کی مشہور تالیفات میں "المختصر القدوری" سب سے نمایاں ہے۔ جس کی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں۔ اسی صدی میں شیخ الائمہ محمد بن احمد ابوبکر سرخسی نے "المبسوط" کے نام سے کتاب فقہ مدون کی۔ امام علی بن محمد بزدوی (م ۴۸۲ھ) اپنی تالیف کتاب الاصول کی وجہ سے مشہور ہیں۔ علامہ ابوبکر کاسانی (م ۵۸۷ھ) مشہور زمانہ کتاب "بدائع الصنائع" کے مؤلف ہیں۔ کتاب کا پورا نام "بدائع الصنائع فی الترتیب الشرائع" ہے۔ یہ بدائع الصنائع کے مختصر نام سے مشہور ہے اور مفتیٰ بہ ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے زندۂ جاوید مصنف علامہ شیخ برہان الدین مرغینانی ہیں۔ (م ۵۹۳ھ)، جو اپنی بےمثل کتاب "الہدایہ" کے باعث مشہور زمانہ ہیں۔ صاحبین کی تصنیفات کے بعد "ہدایہ" جیسی شہرت فقہ حنفی کی کسی کتاب کو شاید ہی میسر آئی ہو۔ آپ کی ایک اور کتاب "شرح بدایۃ المبتدی" ہے لیکن ہدایہ کے سامنے اس کی شہرت ماند پڑگئی۔ ہدایہ تو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور درسیات میں متداول ہے۔

اس کتاب ہدایہ کی قبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی متعدد شروح اور حواشی لکھے گئے۔ ہدایہ کی شروح میں سروجی کی "کفایہ"، علامہ کرلانی کی "وقایہ"، تاج الشریعہ محمود محبوبی نے وقایہ کا خلاصہ "نقایہ" کے نام سے کیا۔ ان تمام شروح میں علامہ کمال الدین ابن ہمام کی "فتح القدیر" (آٹھ جلدوں میں، شرح ہدایہ) مشہور زمانہ ہے جو معتبر و مستند ہے۔

ساتویں صدی ہجری سے پہلے ہی تقلید کا قطعی دور شروع ہو چکا تھا۔ اب صرف فقہ کے متون اور ان پر تعلیقات اور ان کی شرح لکھنے پر اکتفا کیجانے لگی تھی۔ پھر ان تعلیقات اور شروح کی شروح مرتب ہوئیں۔ اور مسائل حنفیہ پر مشتمل فتاویٰ مرتب ہونے شروع ہوئے۔ ان فتاووں کی صراحت "فتاویٰ رضویہ" کے ضمن میں کروں گا۔ اب شرح اور تعلیقات کا ایسا دور شروع ہوا جس نے بہت جلد فقہی خزانہ کو ختم کر دیا۔ اس دور کی مؤلفات اور شروح میں ان کتابوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی اور کچھ

متاخرین فقہا کے نزدیک یہ کتابیں معتبر اور مستند رہیں ۔

المختصر مؤلفہ احمد بن محمد قدوری ۔ متاخرین فقہاء میں وہ چار کتابیں جو چار متون کے نام سے مشہور ہیں، یہ ہیں ۔

وقایہ مختصر الہدایہ ۔ مختار ۔ مجمع البحرین مولفہ ابن الساعاتی (م ۶۸۳ھ) ۔ کنز یا کنز الدقائق مولفہ حافظ علاؤ الدین نسفی (م ۷۲۰ھ) مذکورہ بالا چار متون میں کنز الدقائق سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ ہدایہ کے بعد کنز الدقائق فقہ حنفیہ میں ایک ایسی کتاب ہے جسکے حواشی اور شروح اس طرح مشہور ہوئیں کہ اصل کتاب کی شہرت بھی دب گئی ۔ کنز الدقائق کی شروح میں یہ شروح مشہور زمانہ ہیں :

۱ :۔ تبیین الحقائق :۔ مولف علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ

۲ :۔ رمز الحقائق :۔ مؤلفہ عینی " " "

۳ :۔ بحر الرائق :۔ مولفہ زین العابدین بن نجیم المعروف بہ ابن نجیم

۴ :۔ نہر الفائق :۔ مولفہ عمر بن نجیم

۵ :۔ منحۃ الخالق :۔ مولفہ ابن زین العابدین

۶ :۔ کشف الحقائق :۔ مولفہ افغانی "

متاخرین علماء حنفیہ کی مندرجہ ذیل تالیفات نے بہت شہرت حاصل کی ۔

(۱) جامع الفصولین مولفہ ابن القاضی سماوہ (م ۸۲۳ھ)

(۲) درر الاحکام (شرح غرر الاحکام) مولفہ ملا خسرو (م ۸۸۵ھ) اسکا ایک حاشیہ ۔ غنیہ ذوی الاحکام ۔ از علامہ شرنبلالی بہت مشہور و معروف ہے ۔ ملتقی الابحر ۔ مولفہ علامہ حلبی (م ۹۵۶ھ)

(۵) الدر المنتقی :۔ یہ ملتقی الابحر کی دوسری شرح ہے جو علامہ علاؤ الدین حصکفی کی تالیف ہے ۔ (م ۱۰۸۸ھ) (۶) تنویر الابصار مولفہ علامہ تمرتاشی ۔ یہ ایک ایسی جامع اور فقہ حنفیہ کی معتبر اور مستند کتاب ہے جسکی شروح ہدایہ اور کنز الدقائق کے بعد سب سے زیادہ لکھی گئیں اور وہ بھی بہت مبسوط اور ضخیم ۔

تنویر الابصار کی مشہور ترین ضخیم شرح (۷) الدر المختار ہے یہ علامہ حصکفی کی تالیف ہے ۔ (۸) اور المحتار علی الدر المختار ۔ یہ درمختار کی شرح ہے اور محمد ابن عابدین کی تالیف ہے ۔ اس شرح کا تکملہ ان کے فرزند علاؤ الدین نے کیا ۔ اور (۹) یہ تکملہ قرۃ عیون الاخیار کے نام سے مشہور ہے ۔

رد المحتار فتاوی شامی کے نام سے زیادہ مشہور ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں درمختار کا اردو ترجمہ نولکشوری نسخہ کا عکس ہے اور عام طور پر دستیاب ہے ۔ یہ ترجمہ غایۃ الاوطار کے نام سے مشہور ہے ۔

فقہ حنفیہ کی ان مشہور کتب کے تذکرہ کے بغیر میرا یہ مضمون تشنہ رہتا ۔ علاوہ ازیں اس فہرست کو پیش کرنے کا ایک مقصد خاص اور بھی ہے وہ یہ کہ اس مضمون کا اصل موضوع اعلیحضرت مقتدائے اہلسنت علامہ شاہ احمد رضا خان بریلوی کا فتاوی رضویہ ہے ۔ میں اس مضمون کے قارئین کی توجہ فتاوی رضویہ کے جلد اول کے مقدمہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ حضرت رضا قدس سرہ نے اپنے فتاوی کی جلد اول کو جیسا کہ تصنیف یا تالیف کی نگارش میں مولفین اور مصنفین کا معمول ہے ۔ حمد و نعت اور منقبت سے شروع کیا ہے جو نہایت ہی بلیغ و فصیح انداز میں سپرد قلم کی گئی ہے بادی النظر میں وہ قاری کو صرف حمد و نعت اور منقبت نظر آتی ہے لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ قدس سرہ العزیز نے صنعت ، براعت ، استہلال میں اپنے تبحر علمی سے ان تمام فقہاء حنفیہ کو بیان فرمایا ہے جنکا مختصر تعارف میں نے سطور سابقہ میں آپ سے کرایا ہے اور کمال یہ ہے کہ انشاء میں آورد یا تصنیع کا رنگ کہیں پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ بیاں میں دلکشی اور آمد ہی آمد ہے ۔ قارئین کرام کو حضرت رضا قدس سرہ کے اس لطیف انداز بیاں سے روشناس کرانے کیلئے میں نے کتب فقہ حنفیہ کے اکثر نام بالترتیب زمانہ تالیف و تصنیف

پیش کر دیئے ہیں۔ تاکہ آپ مقدمہ کا حقیقی لطف اٹھا سکیں۔
حضرت علامہ فاضل بریلوی قدس سرہٗ کا مقدمہ براعت استہلال کی
صنعت میں ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

فوٹو اسٹیٹ مقدمہ فتاویٰ رضویہ

(مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں)

اس برصغیر کے دورِ انحطاط میں مدارس عربیہ
جو کچھ خدمت اسلام کی کرتے رہے وہ ہمارے سامنے ہے لیکن
اجتماعی اعتبار سے کوئی اہم کام سرانجام نہ پا سکا۔ علمائے ہندستے
حسبِ ضرورت فقہ حنفیہ پر کچھ کتابیں ضرور لکھیں لیکن ہمارے
متوسلین، متاخرین علمائے کرام کی تالیف و تصنیفات کی طرح
وہ مشہورِ زمانہ نہ ہوئیں۔

تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں اردو زبان میں
مسائل فقہی پر کچھ کتابیں لکھی گئیں۔ مقصدِ تالیف کے تحت
ان کا انداز بالکل عمومی تھا۔ ان تالیفات کا مقصد یہ تھا کہ
عام مسلمانوں کو ان کے دینی احکام سے آگاہ کر دیا جائے اور
غلط راستہ پر چلنے سے ان کو روکا جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت
مولوی رکن الدین صاحب الوری قدس سرہٗ کی ان کوششوں کو
کہاں تک سراہا جائے کہ انہوں نے رکن الدین جیسی آسان اور
تیسیر الفہم کتاب ہر وقت پیش آنیوالے فقہی مسائل پر مرتب فرما
دی۔ شرح وقایہ کے اردو ترجمے بھی ہوئے لیکن اسکو کیا کہیے
کہ مدارسِ اسلامیہ میں جو درسِ نظامی معین و مقرر تھا اس سے
کس کی مجال کہ سرِمو انحراف کر سکے۔ درسِ نظامی میں معقولات
پر بھرپور توجہ کیجاتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے درجہ
سوم میں جا کر کہیں تفسیر و فقہ سے روشناسی حاصل ہوتی تھی۔
(وہ بھی تفسیر جلالین کی حد تک) فقہ حنفیہ کی مشہور کتاب
ہدایہ تک طلباء کے ذہنوں کی رسائی تھی۔ ان مدارس میں فقہ
کے نصاب میں صرف شرح وقایہ اور ہدایہ ہی متداول تھیں۔
(ممکن ہے آپ کو کچھ تبدیلیاں نظر آئی ہوں)۔

مدعائے نگارش یہی ہے کہ جنگِ آزادی کے بعد سے
ہوش ربا حادثات نے دلوں کا سکون چھین لیا تھا اسلیئے ان
دینی مدارس میں جو کچھ تعلیم دیجا رہی تھی وہ بھی بہت غنیمت تھی۔
ورنہ بقول حضرت اکبر الہ آبادی نوبت تو یہاں تک پہنچ گئی
تھی کہ:-

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ایسے پُرآشوب دور میں ہند کے حنفی مسلمانوں کیلیئے
روہیلکھنڈ کے صدر مقام بریلی میں ایک شمع فروزاں ان کا ملجا و
ماویٰ تھی۔ اس ذاتِ گرامی کو اللہ تعالےٰ نے جن کرامتوں سے
بلند فرمایا تھا اور علمِ دین کے جس بے پایاں خزانے کا مالک
بنایا تھا ان چند صفحات میں اسکا کسطرح اظہار کروں۔ وہ
ذاتِ گرامی تھی۔

امام اہلسنت مجدد مائۃ حاضرہ مؤید ملتِ طاہرہ
اعلیحضرت مولینا شاہ احمد رضا خانصاحب قادری نوری قدس سرہٗ
کی جنہوں نے بے دینیوں کی آندھیوں میں چراغِ ایماں کو اپنے
تبحرِ علمی کی دامن کی اوٹ میں اسطرح فروزاں رکھا کہ مسلمانوں
کو ضلالت و گمراہی سے بچایا اور ان کو سرگشتۂ بادیۂ
خذلان و بطلان نہ ہونے دیا۔ اور اپنی علمی توانائیوں سے کام
لیتے ہوئے اس خذلان و ضلالت کے سیلاب کے آگے ایک
مضبوط بند باندھ دیا جو نادان اور کم علم مسلمانوں کی متاعِ
ایمان اور عظمتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوح پرور
جذبات کو اپنی تندرَو میں بہا لیجانے کیلیئے بڑھتا چلا آ رہا تھا
معاشی بدحالی نے بھی مسلمانوں کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔
سر سیّد اور ان کے رفقاء ملّتِ اسلامیہ کا درد دل میں لے کر

اٹھے اور انگریزی زبان ان کے علوم و فنون اور ان کی تہذیب کی
تحصیل کو اس درد کا درماں قرار دیا۔ حضرت اکبر آلہ آبادی چلاتے
رہ گئے کہ :-

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک پر بعض دینی
مدارس کے نظام میں بھی تبدیلیاں کی گئیں۔ اس سلسلہ میں
ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مثال پیش کیجا سکتی ہے۔ اس دورِ
انحطاط میں ایک طبقے نے کفر و شرک کی غلاظت کے انبار
عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متوالوں اور عظمتِ رسول کی
شمع کے پروانوں پر پھینکنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ایسے پُر آشوب
دور میں اعلیٰحضرت عظیم البرکت رحمتہ اللہ علیہ نے مسلمانانِ
ہند کی رہنمائی کا عزمِ صمیم فرمایا۔ اور اس راہ پُر خطر پر اپنے
مضبوط قدم رکھدیئے۔ اور اللہ تعالےٰ نے ان کی مساعی کو
مشکور فرمایا۔ اس یگانۂ روزگار فقیہ بے عدیل و محدثِ
بے نظیر (رحمتہ اللہ علیہ) نے اپنی زندگی کے روز و شب اس
میں صرف فرمادیئے۔ آپ کے قلم کے زور اور بیان کی قوتِ
استدلال نے اعدائے دین کے منہ پھیر دیئے۔ آپنے زبان و
بیان کی تمام توانائیوں کو اس راہ میں صرف فرمادیا۔ فجزاہ اللہ
احسن الجزاء۔ آپ کا ہر نفس اسی راہ میں صرف ہوتا تھا۔
آپ کے قلم سے جو کچھ نکلتا وہ اسی جذبہ کا ترجمان ہوتا۔

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں۔
خسروا، عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا۔

اس سلسلہ میں آپنے صدہا رسائل تحریر فرمائے۔ اگرچہ
آپ کے تبحرِ علمی کی دنیا بہت وسیع تھی۔ تمام علوم معقول و
منقول بشمول ریاضیات، طبعیات، مابعد الطبیعات،
آپ کی طبع و نقاد کی گرفت میں تھے۔ اور یہ تمام رسائل آپ کا
منتہائے علم اور غایت توجہات کبھی نہیں رہے۔ ان رسائل کی
تصنیف سے آپکا مقصد مسلمانوں کے عقاید کا تحفظ اور ان کی
نگہداشت اور ضلالت و گمراہی پھیلانے والوں کے دامِ فریب
سے عامۃ المسلمین کو ہوشیار رکھنا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ
نے جو صدہا رسائل تحریر فرمائے اس مضمون میں اتنی گنجائش
کہاں کہ میں ان کے صرف نام ہی ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ ان رسائل
میں کچھ تو معمولی ضخامت کے ہیں لیکن اپنے دلائل میں بے مثل و
بے نظیر ہیں۔ اور ایسے مبرہن اور مدلل کہ اعدائے دین و سنت
کی زبانیں ان کے مقابلہ میں گنگ ہوگئیں۔ اور بعض رسائل
ضخیم بھی ہیں۔ جیسے الدولتہ المکیہ وغیرہ۔ لیکن تفقہ فی الدین
میں آپ کی فکر و قلم کا شاہکار آپ کا "فتاویٰ رضویہ" ہے
جو بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک جلد
ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی
ہر جلد میں متعدد رسائل بھی موجود ہیں۔ کیونکہ بعض سوالات
کے تفصیلی اور مدلل جواب کیلئے دو چار صفحات ناکافی ہیں۔
اسلیئے جواب میں ایک رسالہ مرتب کرنا پڑا۔ اگر ہر جلد کے ان
رسائل کو یکجا کر لیا جائے تو وہ موضوع متعلقہ پر فقہ حنفیہ
کی ایک مبسوط کتاب ہوگی۔ فتاویٰ رضویہ کے سلسلہ میں مزید
کچھ عرض کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اپنے قارئین کو یہ
بتادوں کہ مذاہبِ اربعہ میں فقہ حنفیہ کو یہ اعزاز و شرف حاصل
رہا ہے کہ اس مذہب میں فتاویٰ کے جسقدر مجموعے مرتب
ہوئے ہیں وہ اور کسی مسلکِ فقہ میں مرتب نہیں ہوئے۔
تاریخ فقہ سے پتہ چلتا ہے کہ فقہ حنفی میں فتاویٰ
کی کتابوں میں اولیت کا شرف "فتاویٰ ولوالجیہ" اسکے بعد
"فتاویٰ قاضی خان" ہے۔ فتاویٰ ولوالجیہ کا مجموعہ علامہ
عبدالرشید والوالجیؒ (م ۵۴۰ھ) کی تالیف ہے اور
فتاویٰ قاضی خان علامہ حسن بن منصور (م ۵۹۲ھ) کے

تالیف ہے۔ آپ کا پورا نام امام فخر الدین حسن بن منصور
الاوزجندی الفرغانی ہے۔ یہ فتاویٰ فقہ حنفیہ میں بہت
مشہور و معتبر ہے۔ اور فتاویٰ ہندیہ کے حاشیہ پر طبع ہوا ہے
(یہ چار جلدوں پر مشتمل ہے) اس کے بعد فتاویٰ ظہیریہ
ہے۔ جو فقیہ اعظم ظہیر الدین محمد بخاری (م ۶۱۹ھ) کی
تالیف ہے۔ یہ تینے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے فتاویٰ
کے مجموعے۔

آٹھویں صدی ہجری کا مشہور مجموعہ فتاویٰ۔
"فتاویٰ طرطوسیہ" ہے جو انفع المسائل الی التحریر المسائل کے
نام سے معروف ہے۔ یہ علامہ ابراہیم بن علی طرطوسی (م ۷۵۸ھ)
کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ سرزمین برصغیر پاک وہند میں سلطان
فیروز تغلق کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں
صوبہ بہار کے ناظم تتار خان کے نام پر معنون شیخ عالم ابن
علاؤالدین متوفی ۸۰۰ھ نے آٹھویں صدی ہجری کے
رو آخر میں یہ فتویٰ مرتب کیا اور ناظم بہار کے نام سے معنون کرتے
ہوئے اسکو "فتاویٰ تتار خانیہ" سے موسوم کیا۔ یہ فتاویٰ بہت
مشہور و معروف ہے اور مابعد کے فتاویٰ میں اس کے حوالے
بکثرت موجود ہیں (جسکے بارے میں سابقہ صفحات میں کہا بھی
جا چکا ہے)

نویں صدی ہجری میں علامہ حفیظ الدین المعروف
بہ ابن بزاز (م ۸۲۱ھ) نے جو فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کیا وہ
ان کی آبائی نسبت سے "فتاویٰ بزازیہ" کہلاتا ہے۔ دسویں
صدی ہجری میں یا تو کوئی مجموعہ فتاویٰ مرتب ہی نہیں ہوا۔
اگر ہوا تو مشہور نہیں ہوا۔

گیارہویں صدی ہجری میں فقیہ المعروف مولانا خیر الدین
منیف فاروقی رملی (م ۱۰۸۱ھ) نے "فتاویٰ خیریہ" مرتب کیا
(ترکی کے محکمہ قضاۃ میں اسکو معتبر مانا جاتا ہے اور مفتیٰ بہ ہے)

اسی صدی میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ سلطنت میں
اس برصغیر میں فقہ حنفیہ پر ایک عظیم کام ہوا یعنی ملا نظام الدین
المعروف بہ اور ملا احمد جیون کی سرکردگی میں علمائے حنفیہ کی
ایک جماعت نے آٹھ سال کی محنت سے ایک مجموعہ فتاویٰ
مرتب کیا جو "فتاویٰ ہندیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فتاویٰ فقہ
حنفیہ میں بہت معتبر اور مفتیٰ بہ ہے۔ صرف ہندوستان ہی میں
نہیں بلکہ بلادِ اسلامیہ میں بھی مشہور و معروف ہے۔ اور کئی بار مصر
میں طبع ہو چکا ہے۔ اس کے حاشیہ پر "فتاویٰ قاضی خان" ہے
فتاویٰ ہندیہ ۳۶ × ۲۳ پر چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔
بارہویں صدی ہجری میں مفتی دمشق قاضی حامد آفندی ابن علی
عمادی (م ۱۱۷۱ھ) نے "فتاویٰ حامدیہ" مرتب کیا جو شام اور
عراق کے حنفیوں میں معتبر و مستند ہے۔ فتاویٰ ہندیہ کے بعد برصغیر
پاک وہند میں حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند عالم متبحر، محدث
مفسر و فقیہ شاہ عبد العزیز صاحب نے فتاویٰ عزیزیہ مرتب کیا
جسکے متن کی زبان فارسی تھی۔ اردو میں اس متن کا ترجمہ ہو چکا ہے
شاہ صاحب کو فقہ و حدیث میں بڑی دسترس تھی۔ اسلئے ان کا
یہ فتاویٰ بڑا مستند و معتبر ہے۔ فتاویٰ کی تاریخ میں فتاویٰ
عبد الحی (مولانا عبد الحی فرنگی محلی لکھنوی) کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے
ان کی اس خدمت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی یہ فتاویٰ
دستیاب ہے۔ تیرہویں صدی ہجری میں ممالکِ اسلامیہ میں مفتیٔ
شیخ محمد عباسی مہدی کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ مہدیہ" کے
نام سے مصر میں طبع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ برصغیر میں فتاویٰ
کی تدوین عمل میں آئی۔ "فتاویٰ رضویہ" تیرہویں صدی ہجری کے
عشرہ آخر میں اور چودہویں صدی کے ربیع الاول میں لکھے گئے
والے فتاووں کا مجموعہ ہے۔ جو اعلیٰحضرت امام اہلسنت، فقیہ
محدث علامہ شاہ احمد رضا خان قادری، نوری، قدس سرہٗ
فطانت و ذکاوت، تبحر علمی اور تفقہ فی الدین کا ایک شاہ

ادوار تک کئی رسال ہو چکے ہیں۔ ایسا جامع اور مبسوط، مدلل و مبرہن کوئی دوسرا مجموعہ فتاویٰ حنفیہ کا مرتب نہ ہو سکا جبکہ خود اعلیٰحضرت قدس سرہٗ نے مقدمہ میں صراحت فرمائی ہے۔ اس مجموعہ کا نام "العطایا النبویہ فی فتاوی الرضویہ" ہے۔ جو صاحب فتاویٰ کی صراحت کے مطابق سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ فتثقل الاجباب، حجم المجلدات وجزءھا علی اثنی عشر۔ اس کو بارہ جلدوں میں منقسم کر دیا گیا۔ اور یہ عمل خود صاحب فتاویٰ کی اجازت سے سرانجام دیا گیا۔ اس تدوین کے بعد بھی اعلیٰحضرت عظیم البرکت کے وصال تک سیکڑوں فتاویٰ اور جمع ہو گئے تھے۔ اسطرح اسکی اور جلدیں مرتب و مدون کی گئیں۔ اسطرح آج فتاویٰ رضویہ ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ بعض مجلدات ہندوستان میں طبع ہوئی ہیں۔ اور چند جلدیں پاکستان میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے ہاتھوں میں ہیں برصغیر میں فتاویٰ رضویہ فقہ حنفی پر مشتمل آخری گرانقدر مجموعہ فتاویٰ ہے۔ چودہویں صدی کے آخر تک ایسا مہتم بالشان اور کوئی فتاویٰ مرتب نہیں ہوا۔

فتاویٰ رضویہ کی ہر ایک جلد کا ایک موضوع ہے۔ مثلاً جلد اول کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے جسکے تحت مختلف ابواب ہیں۔ اسی طرح دوسری جلد کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اور وہ بھی مختلف ابواب کی حامل ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ ناظرین فتاویٰ خود اس سلسلہ میں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مجھے ابھی فتاویٰ رضویہ کے بارے میں بہت کچھ عرض کرنا ہے۔

فتاویٰ رضویہ کی تدوین کا نہایت ہی مختصر سا صوری تعارف کرانے کے بعد مجھے فتاویٰ رضویہ کی معنوی حیثیت (اس کی بلند پائیگی) مسائل کے استنباط و استخراج اور ان کے استدلال کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے کہ "خواجہ تا شانِ بارگاہِ رضا" کے سامنے اس پہلو کو شاید ابھی تک کما ینبغی پیش نہیں کیا گیا ہے اور یہی اس مضمون کی نگارش کا مدعائے خاص ہے۔

فتاویٰ رضویہ سے اگر سوالات کو حذف کر دیا جائے تو اسکی ہر جلد اس فقہی موضوع پر ایک کتاب ہے۔ اور ایک مستقل تصنیف بن جاتی ہے۔ جس میں آپ کو اس فقہی موضوع سے متعلق تمام جزئی مسائل بھی پوری صراحت اور دلالت کے ساتھ ملیں گے۔ اس سلسلہ میں ایسی موشگافیاں کی گئی ہیں اور ان حدوں تک پہنچایا گیا ہے۔ ایسے نکات سے روشناس کرایا گیا ہے اور زیر بحث لایا گیا ہے کہ ان تک ان فقیہہ بالغ نظر کی نگاہ ہی پہنچ سکتی ہے۔ حضرت رضا قدس سرہٗ نے ان جزئی مسائل کو اپنی قوتِ استخراج اور طبع وقاد سے ان دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو ہمارے فقہائے متقدمین اپنی مختلف تصانیف میں بیان کر چکے ہیں۔ ان دلائل و براہین کا استقصاء ان دلائل پر اعتراضات اور ان کے رد میں دلائل سنیہ و براہین قاطعہ کی تخریج کوئی آسان بات نہیں۔ ارباب علم و فضل جانتے ہیں کہ اس کیلیے صرف وسعتِ نظر ہی درکار نہیں بلکہ وسعتِ معلومات بصیرت، اور متونِ مختلفہ کا استحضار بھی ضروری ہے۔ بغیر اس کے ان جزئی مسائل پر بحث و تمحیص اور ان مسائل کی تنقیح و تفقیح نہیں ہو سکتی۔ میں نے تاریخ فقہ حنفیہ میں جن معتبر و مستند کتابوں کی نشاندہی کی ہے اور اعلیحضرت عظیم البرکت نے جنکو بطور سند براعتِ استہلال اپنے مقدمہ "العطایا النبویہ" میں بیان فرمایا ہے۔ ان تمام کتب پر حضرت والا کی نظر تھی۔ اور آپ کو اپنے فقہی مسائل کی تائید یا استدلال میں ایسے مقامات کی تلاش، تجسس اور تفحص کیلئے ان کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ وہ آپ کیلئے بالکل مستحضر تھیں۔ آپ نہایت آسانی سے ان حوالوں کو ترقیم و تحریر کرتے چلے گئے تھے۔ جو مسائل زیر بحث کی تائید و استدلال

کے لئے ضروری ہوتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تقلید کیساتھ ساتھ اکثر
مقامات پر آپ کی گرانقدر رائے کے اجتہادی پہلو بھی ہمارے سامنے
آتے ہیں۔ آپ فقہائے سلف سے اختلاف رائے بھی کرتے تھے
لیکن آپ کا یہ اختلاف امت کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ آپ کا
اختلاف برائے اختلاف کبھی نہیں ہوتا بلکہ آپ دوسرے فقہائے
کرام سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی جس رائے کو پیش فرماتے ہیں
اس میں نہایت وزن ہوتا ہے اور آپ کی نگاہ دور اس اپنے
قول اور اپنی رائے کی تائید میں متقدمین میں سے اسکا قیاس
تلاش کر لیتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ اسکے لیے جس علمی
کمال کی ضرورت ہے وہ ہر ایک کو نہیں ملتا۔ اللہ تعالےٰ نے یہ
وصف خاص حضرت رضا قدس سرہ کی فکر دور بین اور نگاہ دور رس
کو عطا فرمایا تھا۔ آپ ایسے مقامات پر بھی اصول فقہ سے سر مو
انحراف نہ فرماتے بلکہ اس کی پوری پوری پابندی فرماتے تھے۔

میں فتاویٰ رضویہ سے اگر چند ایسے مقامات بھی پیش کروں
تو یہ مضمون تیس چالیس صفحات کی وسعتوں کا طالب ہوگا۔ اور پھر
یہ چند صفحے بالکل ناکافی ہوں گے۔ اسلیے مجبوراً اس تفریع سے قلم
روک رہا ہوں۔ بعض جزئیات فقہی سے اختلاف اور اس جزئے
مسئلہ کی اہل فقیہانہ کو پیش کرتے ہوئے اپنے بعض مسائل کی تصریح
میں ان کے استحباب و استحسان میں کلام کیا ہے۔ لیکن ایسے مقامات
پر بھی آپ کا یہ ظاہری اجتہاد، اجتہاد ذاتی نہیں ہوتا بلکہ جب آپ
فرمایا متوسطین فقہا کے کلام سے اس کی تائید میں کوئی جزئیہ پیش فرما
دیتے ہیں تو وہ آپ کا اجتہاد ذاتی نہیں ہوتا بلکہ آپ کی فکر دقیقہ
سنج و دقت نظر کا وہ ایک شاہکار بن جاتا ہے۔

حضرت رضا قدس سرہ جس مسئلہ پر خواہ وہ کلیہ ہو یا پھر
جزئیہ جب قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے ہر پہلو پر بحث کرتے ہوئے
اس کے ہر ممکنہ پہلو یا صورت کو پیش فرماتے ہیں۔ اس کے بعد اسکے
جواز یا عدم جواز، استحسان یا استحباب کا حکم صادر فرماتے ہیں۔

ایسے ہی مقامات پر فتاویٰ ہندیہ اور فتاویٰ رضویہ کا استدلالی
فرق نظر آتا ہے۔ جبکہ صورت یہ ہے کہ فتاویٰ ہندیہ کے فتوے
چند فقہا کی نظر میں بحث و نظر کے ذریعہ کسی فیصلے پر منتج ہوتے تھے۔
اور یہاں صرف ایک فرد، ایک طبع وقاد اور ایک فکر ساطع مسئلہ
زیر بحث پر تمام متفق اور مختلف آراء کو پیش کرتی ہے اور پھر
اس سے نتیجہ اخذ کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیت العلماء میں
بیس سے زیادہ علماء کی کوششوں سے کئی سال میں مرتب ہونیوالا
"فتاویٰ ہندیہ"، کسی مسئلہ کے ہر پہلو کی تنقیح و تفحص میں "فتاویٰ
رضویہ"، کی وسعت استدلال و تنقیح و تفریع اور دلائل و براہین
کی وسعتوں تک نہیں پہنچ سکا۔ اس مقام پر پہنچ کر دل تو یہ چاہتا ہے
کہ ایک مشترکہ مسئلہ کو پیش کر کے فتاویٰ ہندیہ اور فتاویٰ رضویہ کے
طرز استدلال اور ہمہ جہتی تفحص اور تنقیح کو پیش کروں لیکن مجبور
ہوں کہ چند صفحات کی قید سے مقید یہ مضمون اسکا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالےٰ نے اعلیٰحضرت فاضل بریلوی قدس سرہ کو تمام تر
بصیرت عطا فرمائی تھی جسکی ایک فقیہہ کیلیے ضرورت ہے۔ یعنی
تعمق فکر، جودت طبع اور ذہن رسا کے ساتھ ساتھ علم قرآن
علم تفسیر، اصول حدیث و حدیث کا ماہر ہو۔ صرف یہی نہیں کہ
منقولات پر اس کی بصیرت اسکے لیے کافی ہو گی۔ بلکہ علوم معقول
اور نظری پر بھی اسکو کامل دسترس ہو۔ فلسفہ، علم کلام، منطق،
فلکیات، طبیعیات، مابعد الطبیعیات اور خلاف وجدل پر بھی
اسکو کامل عبور ہو۔ اور دستگاہ کامل رکھتا ہو۔ اسلیے کہ ایک فقیہہ
کے پاس مختلف النوع مسئلے آتے ہیں اور گوناگوں قسم کے مسائل
آتے ہیں۔ اگر وہ ان تمامی علوم سے بہرہ ور نہیں تو وہ جواب باصواب
دینے سے قاصر رہے گا۔ پس فقہ کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس کی
اکناف میں جمیع علوم و فنون داخل ہیں۔

میں اس مختصر مضمون میں اعلیٰحضرت کے تبحر علمی
آپ کی بصیرت، آپ کے ذہن رسا کی رفعت، جودت فکر، قدرت

استخراج اور قوتِ استدلال پر کیا کہوں۔ علوم منقول اور معقول میں کون سا ایسا علم تھا جس پر آپ کو کامل دستگاہ نہ تھی، یہی سبب تھا کہ آپ کی خدمت میں مسائل متنوعہ ارسال کیے جاتے تھے۔ اور آپ ہر ایک مسئلہ کا محققانہ جواب تحریر فرماتے۔ خواہ اسکا تعلق کسی علم منقول یا معقول سے ہو۔ وہ فلکیات سے متعلق ہو یا بعد الطبیعات سے، آپ ہر متعلقہ مسئلہ پر یا سوال پر ایسی محققانہ بحث فرماتے تھے کہ بس یہی علم ہوتا کہ آپ اس علم میں بھی صاحبِ کمال ہیں۔ فتاویٰ رضویہ کے مجلدات ملاحظہ فرمائیے۔ آپکو مسائل کا یہ تنوع بخوبی نظر آئیگا۔ اسی تنوع کے ساتھ ساتھ ان مسائل کے جواب میں آپ حضرتِ والا مرتبت کے تبحر کی جھلکیاں بھی دیکھیں گے۔

فتاویٰ رضویہ کا اندازِ تحریر

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ ہر موضوع کیلیے ایک مخصوص اسلوب بیان ہوتا ہے۔ تاریخی واقعات شاعرانہ رنگ میں اور تنقید تاریخی انداز میں اور اسلامیات کو تنقید کے اسلوب اور انداز میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ موعظت کیلیے اندازِ بیان اور ہے اور حقائق کے اظہار کے لیے اور۔ اگر کوئی اس مسئلہ اصول کے خلاف عمل پیرا ہوگا تو اسکا اسلوب ناقابل قبول اور اثر آفرینی سے خالی نہ ہوگا۔ تنقید، تاریخ، روایات و قصص کے اردو زبان میں اسالیب معین و مخصوص ہیں۔ تاریخِ ادب کی طرح تاریخِ فقہ کو بھی اسی اسلوبِ بیان میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فقہی مسائل اور اس کے جزئیات کو تاریخ کے جزئی واقعات کے اسلوب میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اعلیٰحضرت مقتدائے اہلسنت کا مشہور ترجمہ قرآنِ پاک موسوم بہ کنز الایمان سلاستِ زبان اور اردو زبان کے روزمرہ محاورات کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔ ترجمہ کی سلاست اور روانی مسلمہ ہے لیکن فقیہانہ استدلال اور فقہی ابحاث ایسے سادہ اور سلیس اندازِ بیان کے ظرفِ تنگ میں نہیں سما سکتی ہیں اسلیے انکے لیے تو فقیہانہ انداز ناگزیر ہے۔ مسائلِ فقہی کو فقہ ہی کی زبان میں پیش کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر حضرت قدس سرہٗ کے فقیہانہ اندازِ بیان میں زبان کی چاشنی دیکھنا چاہتے ہیں کہ:

حسرتِ نو کا سانحہ سنتے ہی دل بگڑ گیا
ایسے مریض کو رضا مرگِ جوان سنائی کیوں

تو یہ آپ کی بھول ہوگی۔ لہٰذا حضرت رضا قدس سرہٗ نے مسائل فقہی کے استدلال میں اسی فقیہانہ اسلوب کو اپنایا ہے۔ ہاں جہاں آپ کا بیان یا مسئلہ کا جواب براہین سے مبرہن نہیں، وہاں آپ کے بیان کی سادگی اور اندازِ تفہیم سلاستِ زبان سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اور جہاں استدلال و براہین یا تائیدِ کلام میں اصولِ فقہ کے دلائل کو پیش کیا ہے وہاں نہ سلاستِ بیان کی ضرورت ہے نہ آپ نے اسکا اہتمام فرمایا ہے۔ جب کسی عالم کی طرف سے کوئی سوال پیش کیا جاتا تو حضرت رضا قدس سرہٗ اسکا جواب بھی عالمانہ رنگ میں مرحمت فرماتے اور اگر وہ غیر عالم یا معمولی لیاقت رکھنے والے شخص کی جانب سے ہوتا جسکا اندازہ امرِ مسئول سائل کے زبان و بیان ہی سے ہو جاتا تو حضرت اسکا جواب سائل کے اندازِ بیان ہی کے مطابق، سادہ، رنگ اور اسلوب میں مرحمت فرماتے۔ اسی طرح آپ سائل کی زبان کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اگر سوال اردو میں کیا گیا ہے تو جواب بھی اردو میں دیا گیا ہے اور اگر سوال عربی زبان میں ہے تو اسکا جواب بھی عربی زبان میں دیا گیا ہے اور اگر سائل نے فارسی زبان میں مسئلہ دریافت کیا ہے تو حضرت رضا قدس سرہٗ نے اسکا جواب بھی فارسی زبان میں مرحمت فرمایا ہے کیونکہ حضرتِ والا مرتبت ان تمام زبانوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔

ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ حضرتِ رضا قدس سرہٗ کے مسعود عہد میں برصغیر پاک و ہند کی عام زبان اردو تھی۔

آپ کی خدمتِ سابق میں اسی زبان میں مسائل شرعیہ پر مبنی سوالات بھیجے جاتے تھے اور آپ بھی سادہ اور عام فہم اردو میں ان کے جوابات مرحمت فرماتے تھے۔ اور پھر آپ کے زبان کی سلاست اور روانی میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی تھی۔ البتہ جہاں فقہی استدلال اور تائید بیان کیلیے ضرورتاً آپ کسی فقہی متن کو پیش کرنا ہوتا تھا تو آپ فہم مسائل کے لیے اس متن کا ترجمہ بھی رقم فرمادیا کرتے تھے لیکن جہاں عالمانہ مسائل بیان فرماتے اور آپ سمجھتے کہ سائل یا میرا مخاطب صاحبِ علم و فضل ہے لیکن سوال اردو میں ہوتا تو آپ کے جواب میں بھی عالمانہ رنگ پیدا ہو جاتا تھا اور آپ متون فقہی کا ترجمہ اردو میں پیش کرنا ضروری خیال نہیں فرماتے تھے۔ اکثر علمائے اہلسنت نے عربی زبان میں آپ سے کسی مسئلہ میں استفسار کیا تو اس کا جواب آپ نہایت شستہ، شگفتہ اور اکثر مقامات پر مسجع و مقفع عربی میں دیا۔ آپ نے شکوہِ الفاظ سے زبان یا طرزِ ادا کو کبھی ژولیدہ نہیں بنایا۔ اردو کی طرح آپ کی عربی زبان کا طرزِ ادا بھی بہت دلکش اور سلجھا ہوا ہے۔ اور ایک اہلِ زبان کی طرح نہایت رواں اور دلکش اسلوب میں تصنع سے عاری عربی میں جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ اردو زبان کی طرح آپ کی عربی عبارات یعنی طرزِ ادا میں ایک بے ساختگی ہے۔ اور استدلال میں وہی قوتِ بیان ہے جو اردو زبان میں آپ کے یہاں موجود ہے۔

یہ تھیں وہ چند خصوصیات جن کے باعث فتاوٰی رضویہ اہلِ سنت کیلیے سرمایۂ عقیدت ہی نہیں بلکہ عبادات و معاملات میں آئے دن پیش آنے والے ہزاروں مسائل کے جوابات پر مبنی بیش بہا خزانہ ہے۔ الحمدللہ کہ فتاوٰی رضویہ اہلِ سنت کے لیے سرمایۂ نازش و افتخار ہے اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم اس پر نازاں ہے۔ کاش فتاوٰی رضویہ کی تمام جلدیں پاکستان میں شائع ہوں اور شایانِ شان طریقہ پر۔ اس وقت جو فتاوٰی رضویہ دستیاب ہے اس میں خطِ نسخ کی کتابت اچھی نہیں ہے۔ اسی طرح خطِ نستعلیق بھی اعلیٰ نہیں صحت کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

اکثر و بیشتر مسائل کی تنقیح و توضیح میں متعدد فقہی کتب کے حوالے اور ان کے متون پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ان کا ترجمہ نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ فتاوٰی رضویہ کی آئندہ طباعت میں ایسے مقامات پر ان عبارات کے ترجموں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ خواہ متن فتوٰی میں یا حاشیہ پر۔ تاکہ اس دور کے کم سواد مسلمان بھی اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ وَمَا توفیقی الا باللہ۔

خدا تیرا خدا ہے تو خدا کا پاک بندہ ہے
خدا تو تو نہیں نورِ خدا خلقِ مجسم تو ہے
تری تعریف میں جتنا پڑھیں سب تجھکو شایاں ہے
فقط اک ناروا یہ ہے کہ یوں کہیے خدا تو ہے

رہا نہ شوق کبھی مجھ کو سیرِ دیواں سے
ہمیشہ صحبتِ اربابِ شعر سے ہوں نفور
نہ اپنے کاموں سے تضییعِ وقت کی فرصت
نہ اپنی وضع کے قابل کہ آئیں ہوں مشہور
رہی وبال سے اس کے مجھے سبکدوشی
کہ ویسے ہی ہے گراں سر پہ بارِ جرم و قصور
جبیں طبع ہے ناسودۂ داغِ شاگردی
غبارِ منتِ اصلاح سے ہے دامن دور
مگر جو ہاتفِ غیبی مجھے بتاتا ہے
زباں تک اسے لاتا ہوں میں بحمدِ حضور

اعلیٰحضرت بریلوی

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

الحمد لله هو الفقه الاكبر والجامع
الكبير لزيادات فيضه المبسوط
الدرر الغرر، به الهداية، ومنه
البداية، واليه النهاية، بحمده
الوقاية، ونقاية الدراية،
وعين العناية، وحسن الكفاية،
والصلاة والسلام على الامام
الاعظم للرسل الكرام، مالكي و
شافعي احمد الكرام، بقول
الحسن بلا توقف، محمد الحسن
ابو يوسف، فانه الاصل المحيط،
لكل فضل بسيط، ووجيز ووسيط
البحر الزخار، والدر المختار
وخزائن الاسرار، وتنوير الابصار
ورد المحتار على منح الغفار
وفتح القدير، وزاد الفقير
وملتقى الابحر ومجمع الانهر،
وكنز الدقائق وتبيين الحقائق
والبحر الرائق، منه يستمد
كل نهر فائق، في المنية،
وبه الغنية، ومراقي الفلاح،
وامداد الفتاح، وايضاح الاصلاح
ونور الايضاح، وكشف
المضمرات، وحل المشكلات،
والدر المنتقى، وينابيع المبتغى،
وتنوير البصائر، وزواهر
الجواهر، البدائع النوادر،
المنزه وجوبا عن الاشباه
والنظائر، معين السائلين، و
نصاب المساكين، الحاوي
القدسي لكل كمال قدسي
وانسي، الكافي الوافي الشافي،
المصفى المصطفى المستصفى،
المجتبى المنتقى الصافي،
عمدة النوازل، وانفع الوسائل
لاسعاف السائل بعيون المسائل
عمدة الاواخر، وخلاصة
الاوائل، وعلى آله وصحبه،
واهله وحزبه مصابيح الدجى،
ومفاتيح الهدى، لاسيما
الشيخين الصاحبين الآخذين
من الشريعة والحقيقة بكلا
الطرفين، والختنين الكريمين
كل منهما نور العين ومجمع
البحرين، وعلى مجتهدي
ملته، وائمة امته،
خصوصا الاركان الاربعة
والانوار اللامعة، وابنه
الاكرم، الغوث الاعظم
ذخيرة الاولياء، وتحفة
الفقهاء، وجامع الفصولين،
فصول الحقائق والشرع المهذب
بكل زين، وعلينا معهم
وبهم ولهم، يا ارحم
الراحمين، آمين آمين
والحمد لله رب العلمين.

جدید و قدیم سائنسی افکار و نظریات

اور

امام احمد رضا

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب
(پرنسپل گورنمنٹ کالج ٹھٹھہ)

محترمی ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ موصوف نے فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان صاحب قدس سرہ کی شخصیت، ان کے علمی و ملی کارناموں کو اجاگر کرنے کیلئے کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں بعض لوگوں کے بقول ڈاکٹر صاحب کا قلم فاضل بریلوی کیلئے مخصوص ہوگیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات و تالیفات پر تبصرہ ممکن نہیں۔ زیر نظر مقالہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی کاوش کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات مجمع البحرین ہے۔ ایک طرف ڈاکٹر صاحب دینی کتابیں مرتب فرماتے رہتے ہیں دوسری جانب علوم حاضرہ پر بھی ڈاکٹر صاحب وسیع نظر رکھتے ہیں۔ موصوف گورنمنٹ کالج ٹھٹھہ میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ادارہ معارف رضا کے ارکین ڈاکٹر صاحب کے شکر گزار ہیں جنکے مفید مشوروں سے یہ مجلہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے ——————— سید ریاست علی قادری

(۱) امام احمد رضا[۱] نے علوم عقلیہ کی ابتدائی تحصیل بعض اساتذہ سے کی مثلاً مولانا نقی علی خان، ابوالحسین احمد النوری مرزا عبدالعلی رامپوری، اور مرزا غلام قادر بیگ وغیرہ مگر ان علوم میں اپنی خداداد صلاحیت سے کمال حاصل کیا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ جب ریاضی اور جیومیٹری وغیرہ کی تحصیل شروع کی تو ان کی فطری ذکاوت کو دیکھ کر ان کے والد مولانا محمد نقی علی خان نے کہا۔

"تم اپنے علوم دینیہ کی طرف متوجہ رہو۔ ان علوم کو خود حاصل کرلوگے۔"[۲]

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نہ صرف یہ کہ ان علوم کو حاصل کیا بلکہ ان علوم پر مختلف تصانیف اور حواشی لکھے۔ خود لکھتے ہیں۔

حسب ارشاد سامی بعونہ تعالیٰ فقیر نے حساب و جبر و مقابلہ و لوگارثم و علم مربعات و علم مثلث کروی و علم ہیئت قدیمہ و ہیئت جدیدہ و زیجات و ارثماطیقی وغیرہا میں تصنیفات و

تحریرات رائقہ لکھیں اور بعد با قواعد و ضوابط خود ایجاد کیے۔ تحدیثاً بنعمۃ اللہ تعالیٰ [۳]

اس پس منظر میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے یہ ریمارکس قابلِ توجہ ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں قیام شملہ (بھارت) کے زمانے میں مولانا محمد حسین میرٹھی نے جب ان سے امام احمد رضا سے ملاقات کی تفصیلات دریافت کیں تو انہوں نے جواب دیا۔

"ان کو علم لدنی حاصل تھا۔ میرے سوال کا جواب مشکل اور لاحل تھا۔ ایسا فی البدیہہ جواب دیا گویا اس مسئلے پر عرصے سے ریسرچ کیا ہے۔ اب ہندوستان میں کوئی جاننے والا نہیں۔" [۴]

غالباً اسی تاثر کی وجہ سے ملاقات کے فوراً بعد انہوں نے پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاری (صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) سے کہا۔

"صحیح معنوں میں یہ ہستی نوبل پرائز کی مستحق ہے۔" [۵]

جامعہ ازہر (مصر) کے پروفیسر محی الدین الوائی، کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) کی ڈاکٹر باربرا مٹکاف، علامہ اقبال یونیورسٹی (اسلام آباد، پاکستان) کے پروفیسر ابرار حسین صاحب وغیرہم نے علوم عقلیہ میں امام احمد رضا کی حیرت انگیز ذکاوت کا ذکر کیا ہے اور سراہا ہے۔

امام احمد رضا نے علوم عقلیہ جدید و قدیمہ میں مستقل تصانیف چھوڑی ہیں۔ اور علوم نقلیہ کے متعلق تصانیف میں بہت سے عقلی مباحث ہیں جن کو پڑھ کر اہلِ علم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ امام احمد رضا کی عربی تصنیف (الدولۃ المکیہ بالمادۃ الغیبیۃ ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۵ء) کو پڑھ کر پروفیسر ابرار حسین نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

"اعلیٰ حضرت بہت بلند پایہ کے ریاضی دان تھے۔ الدولۃ المکیہ پڑھنے سے (جو میری سمجھ سے بہت بلند ہے) اس کی تصدیق ہوئی۔ کیونکہ انہوں نے وہاں کچھ دلائل ریاضی کے نظریات پر مبنی دیے ہیں اور یہ نظریات وہ ہیں جو آجکل TOPOLOGY کے زمرے میں آتے ہیں۔" [۹]

ایم حسن بہاری نے ایک مقالہ بعنوان "امام احمد رضا جدید سائنس کی روشنی میں" لکھا ہے جس میں علومِ جدیدہ میں امام احمد رضا کے تبحر پر بحث کی ہے اور فتاویٰ رضویہ (جلد اول) کے بعض مضامین سے علم ریاضی، علم کیمیا، اور علم فلکیات میں امام احمد رضا کی مہارت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور لکھا ہے:

"امام احمد رضا کی مذہبی، علمی، ادبی، ریاضی، جغرافیائی، فلکیاتی اور مادی یا سائنسی صلاحیتوں نے راقم الحروف کو کافی متاثر کیا ہے۔" [۱۰]

اسی طرح شبیر حسن بستوی نے اپنے مقالے "امام احمد رضا بحیثیت منطقی و فلسفی" میں ATOM کے بارے میں امام احمد رضا کے نظریات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ [۱۱]

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا نے جو کچھ پایا قرآن کریم اور فضل الٰہی سے پایا۔ وہ قرآنی یقینیات و جدیدیات کو سائنسی ظنیات پر فوقیت دیتے تھے کیونکہ سائنسی نظریات ترقی پذیر ہیں، جو ترقی پذیر ہے وہ مکمل نہیں اور قرآنی نظریات مکمل ہیں۔ نامکمل کو تو مکمل کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے مکمل کو نامکمل کی روشنی میں نہیں۔

قرآن کریم نے فکرِ انسانی کا رخ موڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم انقلاب آگیا۔ ذہنوں میں انقلاب، روحوں میں انقلاب۔ مشہور صحابی حضرت معاویہ کے پوتے خالد بن یزید کے شاگرد جابر بن حیان غالباً اسلام کے پہلے سائنسدان تھے جنہوں نے ایک کیمیائی لیبارٹری بنائی، تاریخ کے مطالعے سے مسلمان مفکرین و سائنس دانوں کا ایک

شاندار سلسلہ نظر آتا ہے مثلاً۔

(۱) دنیائے اسلام کا عظیم طبیب "الرازی" (۸۶۵ء تا ۹۲۵ء) جس نے ۲۰۰ کتابیں لکھیں۔

(۲) "الخوارزمی" (۸۳۵ء تا ۸۴۴ء) جس نے جبر و مقابلہ پر اہم کتابیں لکھیں۔

(۳) "الفارابی" (م ۹۵۱ء) جس نے طبعیات پر اہم کتابیں لکھیں۔

(۴) "المسعودی" (م ۹۵۷ء) جس نے نظریۂ ارتقاء کے بادیات پیش کیے۔

(۵) "ابو علی ابن الہیثم (م ۹۶۵ء) علم بصریات کا ماہر جس نے ریاضیات و طبعیات پر بہت سی کتابیں لکھیں۔

(۶) مشہور طبیب، ماہر فلکیات، ریاضی داں جغرافیہ داں اور عالم طبعیات "ابو ریحان البیرونی" (م ۱۰۴۸ء) جس کی تصنیف "کتاب الہند" شہرۂ آفاق ہے۔

(۷) :۔ عالم اسلام کا مشہور طبیب اور فلسفی "ابو علی ابن سینا" (م ۱۰۳۷ء) جس کی تصانیف "القانون" اور "الشفاء" مغربی دانش گاہوں میں صدیوں داخل نصاب رہیں۔

(۸) :۔ مشہور شاعر اور ریاضی داں "عمر خیام" (م ۱۱۲۳ء) جس نے طب پر ۱۶ کتابیں لکھیں۔

(۹) "ابن رشد" (م ۱۱۹۸ء) جو علم و فضل پر یونانیوں پر سبقت لے گیا۔

(۱۰) :۔ "محمد الدمیری" (م ۱۴۰۵ء) حیاتیات پر جس کی کتاب "حیاۃ الحیوان" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ [۱۲]

امام احمد رضا مشاہیر اسلام کے اس شاندار سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ وہ ان مشاہیر سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر ان کے افکار تازہ پر تحقیقات کی جائے تو ممکن ہے کہ وہ بہت سے مشاہیر سے آگے نظر آئیں۔

ایجاد و اختراع کا دار و مدار فکر و خیال پر ہے۔ خیال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن کریم میں خیالوں کی ایک دنیا آباد ہے اور عالم یہ ہے۔ ے مجبور یک نظر آ ، مختار صد نظر جا۔

ہر خیال اپنے دامن میں صدیوں کے تجربات و مشاہدات سمیٹے ہوئے ہے جس نے اسکی بات مانی اس نے مختصر زندگی میں صدیوں کی کمائی کمالی۔ امام احمد رضا انہی سعادت مندوں میں تھے جنہوں نے سب کچھ قرآن سے پایا۔ وہ قرآن کریم کا زندہ معجزہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکو علم لدنی اور فیض سماوی سے نوازا تھا جس کی روشنی میں وہ لاینحل مسئلے حل کرلیا کرتے تھے۔ [۱۳] اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو افکار تازہ سے نوازا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ بطور تحدیث نعمت لکھتے ہیں۔

"اس ضروری مسئلہ دینی پر کلام بحمد اللہ تعالیٰ کتاب کے خواص سے ہے اور ایک یہی کیا بفضلہ تعالیٰ اس ساری کتاب میں محدود مباحث کے سوا عام ابحاث وہی ہیں کہ فیض قدیر سے قلب فقیر پر فائض ہوئی ہیں اور ایک یہی کتاب نہیں بعونہٖ عز و جل فقیر کی عام تصانیف افکار تازہ سے مملو ہوتی ہیں حتیٰ کہ فقہ میں جہاں متقدمین کو ابداء احکام میں مجال دم زدن نہیں۔ تحدیثاً بنعمۃ اللہ تعالیٰ۔ واللہ ذوالفضل العظیم۔ [۱۴]

امام احمد رضا کی تصنیفات تالیفات اور حواشی کے مطالعے سے ان کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ حاشیہ رسالہ لوگارثم (قلمی) اور حاشیہ رسالہ علم مثلث کروی (قلمی) وغیرہ میں انہوں نے (LOGARITHM) میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں [۱۵]۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اصطلاحات وضع کیں اور قواعد ایجاد کیے [۱۶]

امام احمد رضا نے اپنی علمی بصیرت کی بناء پر بڑے بڑے

فلاسفہ اور سائنس والوں پر تنقید کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو اپنی تحقیق پر کتنا اعتماد تھا اور وہ فلسفہ جدیدہ و قدیمہ پر کتنی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ جامع بہادر خانی کے ایک مسئلے پر ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بناء پر تنقید کی ہے۔ اور اپنے دعوے کے ثبوت میں نظری اور عملی دلائل پیش کیے ہیں۔[17] ایک جگہ مصنف جامع بہادر خانی کی تغلیط کرتے ہوئے کس اعتماد سے لکھتے ہیں :۔

" واقول۔ این بدیہی البطلان و خطائے واضح است"[18]

اسی طرح اپنے رسالے "نوز مبین در حرکت زمین (مشمولہ ماہنامہ الرضا) میں صاحب حدائق النجوم[19] پر سخت تنقید کی ہے۔ مندرجہ ذیل تنقیدات ملاحظہ فرمائیں۔

(ا) دائرۃ البروج کی تعریف کہ حدائق میں کی، باطل ہے کہ معدل سے مرکز بدل گیا :

(ب) اصول الہیات کی تعریف اوس سے باطل تر ہے کہ مرکز بھی مختلف اور دائرے بھی چھوٹے بڑے اور حق وہ ہے جو ہم نے کہا

(ج) حدائق نے سنی سنائی، اپنی ہوشیاری سے سب دوائر کو ایک مقعر سماوی پر لیا جس کا مرکز، مرکز زمین ہے مگر بھولا کہ تمہارے نزدیک وہ مدار زمین ہے یا مقعر فلک پر اس کا موازی۔ بہر حال اس کا مرکز، مرکز مدار ہے، مرکز مدار زمین مرکز زمین بنا کیسی صریح جنون کی بات ہے

اسی طرح صاحب شمس بازغہ، ملا محمد جونپوری (م ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۲ء) کے بعض خیالات پر سخت تنقید کی ہے حکمۃ العین (مصنفہ نجم الدین علی بن محمد القزوینی م ۶۷۵ھ) اور شرح حکمۃ العین (مصنفہ شمس الدین محمد بن مبارک میرک بخاری) کے بعض مندرجات کو مہمل قرار دیا اور تو اور شیخ[26] ابو علی سینا کے بعض خیالات پر بھی شدید تنقید کی چنانچہ مسئلہ گردش زمین پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

دلیل پنجم اس سے بڑھ کر فلک ثوابت، جملہ مثلات کا بہ تبعیت فلک الافلاک حرکت یومیہ کرنا۔ اور یہاں جو ابن سینا نے فرضیت کی جگہ گڑھی، بالکل شیخ چلی کی کہانی ہے۔ کما بیناہ فی کتابنا الفوز المبین

پروفیسر حاکم علی مرحوم (پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور) نے سائنس کے جدید نظریات کے سلسلے میں بذریعہ مراسلت امام احمد رضا سے تبادلۂ خیال کیا۔ امام احمد رضا نے پروفیسر صاحب کے خیالات کی تردید کرتے ہوئے ان کو یہ ہدایت و نصیحت کی :

بنگاہ ایمانی اصل مقاصد کو دیکھیے اگر حق پائیے تو ابن سینا اور اس کے احزاب کی بات زبردستی بنانے کی ضرورت نہیں

امام احمد رضا نے اپنے خیالات و نظریات کو بڑی جراءت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر کسی محترم شخصیت سے بھی اختلاف ہے تو اسکا برملا اظہار کر دیا ہے مگر ادب و احترام کے ساتھ۔ چنانچہ حضرت امام غزالی کی کتاب تہافتہ الفلاسفہ کی ایک عبارت سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اقول۔ امام کی شان بالا ہے فقیر کو یہاں تامل ہے۔ شک نہیں کہ اجزاء اگرچہ بالفعل نہیں، ان کے مناشی انتزاع موجود ہیں اور ان میں ہر ایک کی طرف اشارہ حسیتہ جدا ہے اور یہی امتیاز ان کے لیے امتیاز اوضاع کا ضامن ہے اور یہ امتیاز قطعاً واقع ہے۔ اعتبار کا تابع نہیں[25]

امام احمد رضا نے جدید و قدیم نظریات کے مقابلے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ جن میں بعض جدید نظریات سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ گو نصف صدی قبل وہ نامعقول نظر آتے ہوں کیونکہ وہ زمانہ جدید سائنس سے مغلوبیت اور مرعوبیت کا زمانہ

تھا ۔ علومِ جدیدہ کے رعب نے دماغ کو ماؤف اور فکر کو مسلوب کر دیا تھا اور ناقص کو کامل پر فوقیت دیجا رہی تھی ۔

امام احمد رضا نے خرق والتیام، خلاء، زمانہ اور ایٹم وغیرہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ اور جدید سائنس دانوں پر تنقید کی ہے مثلاً آئزک نیوٹن، البرٹ آئین اسٹائن البرٹ ولیف پورٹا وغیرہ ۔

خرق والتیام کے بارے میں قدیم فلاسفہ کے علی الرغم امام احمد رضا کا خیال ہے ۔

"فلک پر خرق والتیام جائز ہے"۔[۳۰]

زمانے کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہم چاہتے ہیں کہ بتوفیقہ تعالیٰ اس مزلہ کی بیخ کنی کر دیں جس پر آجتک متفلسفہ کو ناز ہے وہ یہ کہ زمانہ اگر حادث ہو تو اس کا وجود مسبوق بالعدم ہوا اور شک نہیں کہ یہاں قبل و بعد کا اجتماع محال ہے ۔ تو قبلیت نہ ہوگی مگر زمانی تو زمانے سے پہلے زمانہ لازم ۔ مواقف[۳۱] مقاصد[۳۲] تجرید طوسی[۳۳] طوالع الانوار[۳۴] اور بیضاوی[۳۵] و شرح علامہ سید شریف و علامہ تفتازانی و فاضل قوشجی و شمس اصفہانی شرح دیگر طوالع منسوب بہ تفتازانی و تہافتہ الفلاسفہ للامام حجۃ الاسلام وللعلامہ خواجہ زادہ میں اس کے متعدد جواب دیے گئے جن میں فقیر کو کلام تھے"[۳۶]

اس کے بعد امام احمد رضا نے اپنے موقف کی تائید میں ۶ صفحات پر مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ زمانہ حادث ہے ۔

ایک جگہ خلاء پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فلسفہ قدیم خلاء کو محال مانتا ہے، ہمارے نزدیک وہ ممکن ہے"۔[۳۷]

ایٹم[۳۸] کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"جزء لا یتجزی ممکن بلکہ واقع اور اس سے جسم کی ترکیب بھی ممکن، اگر بعض اجسام اس طرح مرکب ہوتے ہیں کچھ محذور نہیں مگر یہ کلیہ نہیں کہ اسطرح کے اجسام میں تماس ناممکن کہ موجب اتصال دو جزء ہے اور حجم حسی جس طرح ہم نے ثابت کیا یونہی تماس حسی ماننا مشکل ہے ۔"[۳۹]

آئزک نیوٹن[۴۰] کے بارے میں پہلے لکھتے ہیں :۔

"نیوٹن نے لکھا ہے کہ اگر زمین کو اتنا دباتے کہ مسام بالکل نہ رہتے تو اس کی مساحت ایک انچ مکعب سے زیادہ نہ ہوتی ۔"[۴۱]

اس قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

اہل انصاف دیکھیں سردار حکمائے جدیدہ نیوٹن نے کتنی صریح خارج از عقل بات کہی[۴۲]

اس کے بعد علمی بحث کی ہے اور پانچ دلیلوں سے نیوٹن کے خیال کی تردید کی ہے ۔

مشہور سائنسدان پروفیسر البرٹ آئین اسٹائن[۴۳] امام احمد رضا کے معاصرین میں تھا ۔ امام احمد رضا نے اپنی تصانیف میں اسکے نظریات پر تنقید کی ہے[۴۴] ۔ دوسرا امریکی ہیئت دان پروفیسر البرٹ الیف پورٹا تھا[۴۵] یہ بھی امام احمد رضا کا معاصر تھا ۔ پروفیسر موصوف نے ایک ہولناک پیش گوئی کی جس سے دنیا کے بعض علاقوں میں دہشت اور سراسیمگی پھیل گئی ۔ اس پیشگوئی کے مطابق ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو آفتاب کے سامنے بعض سیاروں کے جمع ہونے اور ان کی کشش سے آفتاب میں ایک بڑا گھاؤ نمودار ہوتا جس کے نتیجے میں دنیا میں قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی ۔ آندھیاں، طوفان اور زلزلے آتے اور دنیا کے بعض علاقے صفحہ ہستی سے مٹ جاتے یہ پیشگوئی بانکی پور (بھارت) کے انگریزی اخبار ایکسپریس کے ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور پاک

ہند میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس سلسلے میں امام احمد رضا سے رجوع کیا گیا کیونکہ وہ اپنے وقت کے فقیہ ہی نہیں ایک عظیم ہئیت داں بھی تھے۔ امام احمد رضا کو اخبار کا تراشہ ارسال کیا گیا اور ان کی رائے لی گئی۔ جواباً انہوں نے مکتوب (مولانا ظفر الدین بہاری) کو لکھا۔

"آپ کا پرچہ اخبار آیا۔ نواب صاحب نے ترجمہ کیا۔[46] کسی عجیب بے ادراک کی تحریر ہے جسے ہیئت کا ایک لفظ نہیں آتا۔ سراپا اغلاط سے مملو ہے"[47] (محررہ ۴ صفر ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء)

امام احمد رضا نے البرٹ۔ الیف پورٹا کے جواب میں ایک محققانہ رسالہ لکھا جس کا تاریخی نام "معین مبین بہر دور شمس و سکون زمین" (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) رکھا۔

اس رسالے میں امام احمد رضا نے پورٹا کے بیان پر ۱۷ مؤاخذات کیے ہیں اور علم ہیئت سے متعلق فاضلانہ بحث کی ہے آخر میں لکھا ہے:-

"بیان منجم پر اور مؤاخذات بھی ہیں مگر ۱۷ دسمبر کے لیے ۱۷ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم"[48]

رسالہ معین مبین پہلے پہل ماہنامہ الرضا، بریلی، کے دو شماروں (صفر و ربیع الاول ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) میں شائع ہوا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ اردو میں ہونے کی وجہ سے عالمی سطح پر متعارف نہ ہو سکا۔ اور لوگ امام احمد رضا کے افکار سے باخبر نہ ہو سکے۔ ورنہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو دنیا کے مختلف علاقوں میں جو دہشت پھیلی تھی نہ پھیلتی۔ اخبار نیویارک ٹائمز (امریکہ) کے ۱۶ اور ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کے شماروں[49] کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیرس میں ہزاروں لوگ دہشت کے مارے گرجا گھروں میں گئے اور گڑگڑا، گڑگڑا کر دعائیں کیں[50] طلباء نے اسکولوں سے چھٹیاں لے لیں[51] ایک جگہ سائرن اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اور شہر والے سہم کر رہ گئے۔[52]

الغرض ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ مگر جب ۱۷ دسمبر کا آفتاب غروب ہوا تو پروفیسر البرٹ پورٹا کی پیشگوئی جھوٹی ثابت ہوئی اور امام احمد رضا نے جو کچھ فرمایا تھا حق ثابت ہوا۔

دنیا کے سارے ہیئت داں پورٹا سے متفق تھے اور ۱۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو دوربینوں سے مشاہدۂ سماوی میں مصروف قیامتِ صغریٰ کے منتظر تھے مگر بالآخر انکی نگاہیں ناکام ہوئیں ضرورت ہے کہ کوئی فاضل امریکی ہیئت داں پروفیسر البرٹ الیف پورٹا کے مزعومات اور امام احمد رضا کے مؤاخذات و تحقیقات کا علمی تجزیہ اور تقابل کریں۔ اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ امام احمد رضا کے مقابلے میں پورٹا کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔

رسالہ معین مبین کی تصنیف کے بعد سیلان افکار نے دوسرے رسائل کے رخ سے پردہ اٹھایا۔ چنانچہ امام احمد رضا نے اس ضمن میں بعض دلائل رد حرکتِ زمین کے متعلق لکھے جو طویل ہوتے دیکھے تو الگ کر لیے اور رد فلسفہ جدیدہ میں ایک مستقل رسالہ "فوز مبین در حرکتِ زمین" (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) لکھا اپنی تصنیف الکلمۃ الملہمہ میں امام احمد رضا نے اس کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"فقیر نے رد فلسفہ جدیدہ میں ایک مبسوط کتاب مسمیٰ بنام تاریخی "فوز مبین در حرکتِ زمین" لکھی جس میں ایک سو پانچ دلائل سے حرکت زمین باطل کی اور جاذبیت و نافریت مزعومات فلسفہ جدیدہ پر دہ روشن رد کیے جنکے مطالعے سے ہر ذی انصاف پر بحمدہٖ تعالیٰ آفتاب سے زیادہ روشن ہو جائے کہ فلسفۂ جدیدہ کو اصلاً عقل سے مس نہیں۔"[53]

فوز مبین کی فصل سوم میں ذیلی حاشیہ لکھا جس میں وہ روشن دلائل نقل کیے جو فلاسفۂ قدیمہ نے رد حرکت زمین —

پر دیئے ہیں۔ امام احمد رضا نے ان دلائل کے ابطال میں تمیں دلائل پیش کیے اور اس بحث کو ایک تیسری کتاب الکلمتہ الملہمہ فی الحکمۃ المحکمہ لوہا فلسفۃ المشئمہ (مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء) میں مرتب کیا۔[۵۶]

اسلامیہ کالج (لاہور) کے پروفیسر اور پرنسپل پروفیسر حاکم علی مرحوم[۵۷] امام احمد رضا سے بہت متاثر تھے۔ ان کے ہاں آنا جانا تھا اور سائنسی نظریات کے بارے میں بھی ان سے تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔[۵۸] اس سلسلے کی ایک کڑی امام احمد رضا کی کتاب "نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء" ہے جو انہوں نے پروفیسر حاکم علی کی ایک تحریر کے جواب میں لکھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

پروفیسر حاکم علی نے ۱۴ جمادی الاول ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۰ء کو امام احمد رضا کو ایک خط لکھا جس میں حرکت زمین کی تائید میں بعض قرآنی آیات کے ساتھ تفسیر جلالین اور تفسیر حسینی سے بعض عبارات پیش کیں اور امام احمد رضا سے درخواست کی کہ وہ حرکت زمین کے قائل ہو جائیں۔ اس کے جواب میں امام احمد رضا نے ایک مدلل اور محقق رسالہ لکھا جسکا عنوان اوپر گزرا۔ اس رسالے میں امام احمد رضا نے رد حرکت زمین پر اپنے دلائل پیش کیے اور مندرجہ بالا دو کتب تفاسیر کے مقابلے میں ۲۸ کتب تفاسیر وغیرہ سے حوالے پیش کیے[۵۹] امام احمد رضا کے نزدیک مسئلہ حرکت زمین کو دو ہزار سال بعد ۱۵۴۳ء میں کوپرنیکس نے پھر اٹھایا۔ ورنہ بقول امام احمد رضا پہلے نصاریٰ بھی سکون ارض ہی کے قائل تھے۔[۶۰]

امام احمد رضا نے اس رسالے میں پروفیسر حاکم علی کے دلائل کو ضعیف قرار دیا اور مغربی سائنسدانوں کے متعلق لکھا:-

یورپ والوں کو طریقہ استدلال اصلاً نہیں آتا۔ انہیں اثبات دعویٰ کی تمیز نہیں، ان کے اوہام جنکو بنام دلیل پیش کرتے ہیں یہ یہ علتیں رکھتے ہیں بمصنف ذی فہم مناظرہ دال کیلئے یہی ان کے رد میں بس ہیں کہ یہ دلائل بھی انہیں علتوں کے پابند ہوس ہیں"[۶۱]

پروفیسر حاکم علی نے امام احمد رضا سے یہ التجا کی تھی:-

غریب نواز! کرم فرما کر میرے ساتھ متفق ہو جاؤ تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ سائنس کو اور سائنس والوں کو مسلمان کیا ہوا پائیں گے نفت[۶۲]

امام احمد رضا نے اس التجا کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ قرآن کریم پران کے غیر متزلزل ایمان کا آئینہ دار ہے اور ہر مسلمان سائنس دان کے لیے عبرت و نصیحت۔ انہوں نے فرمایا:-

محب فقیر! سائنس یوں مسلمان نہ ہو گی کہ اسلامی مسائل کو آیات و نصوص میں تاویلات دور از کار کر کے سائنس کے مطابق کر لیا جائے۔ یوں تو معاذ اللہ اسلام نے سائنس قبول کی نہ کہ سائنس نے اسلام۔ وہ مسلمان ہو گی تو یوں کہ جتنے اسلامی مسائل سے اسے اختلاف ہے، سب میں مسئلہ اسلامی کو روشن کیا جائے دلائل سائنس کو مردود و پامال کر دیا جائے۔ جابجا سائنس ہی کے اقوال سے مسئلہ اسلامی کا اثبات ہو، سائنس کا ابطال و اسکات ہو۔ یوں قابو میں آئے گی۔ اور یہ آپ جیسے فہیم سائنس دان کو باذنہ تعالیٰ دشوار نہیں، آپ اسے بچشم پسند دیکھتے ہیں۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلتہ۔

امام احمد رضا مسلمان سائنس دانوں کے نقطۂ نظر اور انداز فکر میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن کی روشنی میں سائنس کو پڑھایا جائے یعنی کامل کی روشنی میں ناقص کو پرکھا جائے۔ قرآن نے جو کچھ کہا سائنس بالآخر وہیں پہنچتی نظر آتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ نباتات میں جان ہے، جمادات میں جان ہے، کائنات کے ایک ایک ذرے میں جان ہے۔ پہلے یہ بات عجیب بات لگی۔ اب سب اقرار کر رہے ہیں۔ قرآن نے کہا یہی شب و روز نہیں جو چوبیس گھنٹوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں بلکہ ایک جہاں ایسا بھی ہے جہاں کے شب و روز کا ایک دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہے۔ پہلے یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی

رفتہ رفتہ لوگ یہی حقیقت تسلیم کرنے لگے۔ بھٹک بھٹک کر سب اسی مقام پر آتے جاتے ہیں۔ جہاں قرآن لانا چاہتا ہے۔ ماہرین کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ امام احمد رضا نے "حال" میں بیٹھے ہوئے "مستقبل" کا کہاں تک سفر کیا۔ ممکن ہے وہ نظریات جو امام احمد رضا نے پیش کیے ہیں ان سے قبل یا بعد یورپ و امریکہ کے سائنسدانوں نے پیش کیے ہوں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ نظریات امام احمد رضا سے قبل پیش کیے گئے ہوں۔ تو ایسی صورت میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ امام احمد رضا نے اپنے نظریے کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ وہی ہیں جو ان سے قبل پیش کیے گئے یا ان سے مختلف؟

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ نظریات امام احمد رضا کے بعد پیش کیے گئے ہوں جیسا کہ پروفیسر رفیع اللہ صدیقی نے معاشیات میں نظریۂ "روزگار و آمدنی" امام احمد رضا کی اولیات میں شمار کیا ہے۔[۶۳]

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ نظریات ایسے ہوں جو مفکرین اور دانشوروں نے ابھی تک پیش نہیں کیے۔ ایسے نظریات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کو اہل علم کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور پیش کیا جانا چاہیے۔ مثلاً مسئلہ گردش زمین جو پہلے مسلمات سے تھا۔ اب اس پر بحث شروع ہو گئی ہے جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا۔ امام احمد رضا نے بھی اس کی مخالفت کی اور ۱۰۵ دلائل سے اس کو رد کیا۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ امام احمد رضا نے جو کچھ کہا ہو، جدید سائنسی تجربات و مشاہدات نے حتمی طور پر اس کی تغلیط کر دی ہو اور مزید بحث و مباحثہ کی گنجائش نہ چھوڑی ہو۔ ایسی صورت میں بھی امام احمد رضا داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ کیونکہ عالمی مقابلوں میں شکست کھانے والا بھی انعام کا مستحق ہوتا ہے کہ اس نے ایک بڑے مقابلے کے لیے ہمت تو کی، میدان میں تو آیا۔

جدید و قدیم سائنس کے متعلق امام احمد رضا نے جو کچھ لکھا وہ بیشتر عربی و فارسی میں ہے اردو میں بہت کم ہے۔ چنانچہ عملی دشواری یہ ہے کہ اہل علم و فن عربی اور فارسی سے واقف نہیں اور جو لوگ یہ زبانیں جانتے ہیں وہ علوم جدیدہ پر حاوی نہیں ہیں۔[۶۱] ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے امام احمد رضا سے ملاقات کے وقت اسی عملی دشواری کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے امام احمد رضا سے کہا:-

"افسوس یہ ہے کہ میں عربی سے ناواقف ہوں اور آپ انگریزی سے۔ کیا اچھا ہوتا کہ عربی کتب کا ترجمہ اردو میں ہو جاتا پھر میں انگریزی کر کے شائع کر دیتا۔"[۶۲]

چنانچہ بعد میں انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ امام احمد رضا کی نگرانی میں ان کے افکار و خیالات کو عربی سے اردو میں منتقل کرے۔ مگر اس سے یہ کام نہ ہو سکا کہ فنی کتابوں کا ترجمہ کرنا جوئے شیر لانا ہے۔

۱۹۷۹ء میں راقم نے مشہور سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام کو امام احمد رضا کے کتب و رسائل کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے اظہار معذرت کرتے ہوئے لکھا۔[۶۴]

I shall be happy but I cannot read Arabic

ترجمہ:- مجھے خوشی ہوتی مگر میں عربی نہیں پڑھ سکتا

لیکن راقم کا اندازہ ہے کہ بلاد اسلامیہ ایسے علماء اور دانشوروں سے خالی نہیں جو جدید و قدیم، دونوں علوم پر عبور رکھتے ہوں۔ ادارہ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ کم از کم امام احمد رضا کے نادر کتب و حواشی اپنے ہاں محفوظ کر لینے چاہئیں تاکہ محققین ایک ہی جگہ آسانی سے استقادہ کر سکیں۔

ماخذ و مراجع

(کتب)

احمد رضا: نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان مطبوعہ لکھنؤ۔

" ": حاشیہ رسالہ لوگارثم (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) مطبوعہ کراچی ۱۹۸۰ء

" ": الکلمۃ الملہمۃ فی الحکمۃ المحکمۃ لوہاء فلسفۃ المشئمۃ مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء

" ": حاشیہ رسالہ علم مثلث کروی، قلمی۔

" ": حاشیہ الدر المکنون۔ قلمی۔

" ": حاشیہ جامع بہادر خانی۔ قلمی

" ": تعلیقات علی الزیج الایلخانی۔ قلمی۔

" ": حاشیہ بہادر خانی۔ قلمی۔

" ": معین مبین بہر دور شمس و سکون زمین (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء) قلمی۔

" " " " " " مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء

اقبال احمد فاروقی: تذکرہ علمائے اہل سنت و جماعت۔ لاہور مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ جلد دہم پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

باربرا مٹکاف ڈاکٹر: ہندوستان میں مذہبی قیادت اور علماء مصلحین (۱۸۶۰ھ/۱۹۰۰ء) برکلے ۱۹۸۲ء (انگریزی)

برہان الحق مفتی: اکرام امام احمد رضا۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء

رتن سنگھ بہادر: حدائق النجوم (سہ مجلات) مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۱ء

شجاعت علی قادری مفتی: مجدد الامۃ (عربی) مطبوعہ کراچی ۱۹۷۹ء

شرکت حنفیہ: انوار رضا مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء۔

ظفر الدین بہاری: حیات اعلیحضرت۔ جلد اول مطبوعہ کراچی۔

فیاض محمود: تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۷۲ء

محمد مسعود احمد پروفیسر: عبقری الشرق (انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء

محمد مسعود احمد پروفیسر: فاضل بریلوی اور ترک موالات مطبوعہ لا

محمد یسین اختر مصباحی: امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر (مطبوعہ الہ آباد ۱۹۷۷ء)

نکلس تامس: میراث اسلام: مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء۔

(رسائل)

الرضا (بریلی) شمارہ صفر المظفر ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء۔

" " " ربیع الاول " " " "

" " " ذیلقعد " " "

" " " ذی الحجہ " " "

المیزان (بمبئی)، امام احمد رضا نمبر شمارہ مارچ ۱۹۷۶ء

صوت الشرق (قاہرہ)، شمارہ فروری ۱۹۷۰ء

(اخبارات)

افق (کراچی) شمارہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء۔

جنگ " " ۱۷ " " ۔

" " " ۱۱ مئی " ۔

نیویارک ٹائمز (امریکہ) شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۹ء

" " " " ۱۸ " "

[1] بانی مدرسہ درسیہ (کراچی) مولانا محمد عبدالکریم درس (۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء) نے امام احمد رضا کے سالِ وصال کی مادۂ تاریخ
"مقبولِ حق احمد رضا" (۱۳۴۰ھ) نکالا ہے۔ امام احمد رضا کے حالات و افکار کیلیے راقم کا مقالہ "احمد رضا خان بریلوی" مطالعہ کریں۔ یہ مقالہ
ادارہ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے جریدے ماہنامہ "فکر و نظر" کے مندرجہ ذیل شماروں میں شائع ہوا ہے "اپریل ۱۹۸۰ء
مئی ۱۹۸۰ء، جون ۱۹۸۰ء" مزید تفصیلات کے لیے مندرجہ ذیل مآخذ سے رجوع کریں (ا) فیاض محمود: تاریخ ادبیات مسلمانان
ہند و پاکستان جلد پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء۔ (ب) محمد مسعود احمد، مقالہ "رضا بریلوی"، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد دہم، پنجاب
یونیورسٹی لاہور۔ (ج) محمد یٰسین اختر مصباحی: امام احمد رضا اربابِ علم و دانش کی نظر میں، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۷۷ء (د) المیزان: امام
احمد رضا نمبر، بمبئی، مارچ ۱۹۷۶ء۔ (ھ) انوارِ رضا۔ شرکتِ حنفیہ لمیٹڈ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء۔ (و) شجاعت علی قادری: مجدد
الامۃ (عربی) مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء۔ (ز) محمد مسعود احمد: عبقری الشرق (انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء۔ (ح) محمد برہان الحق: اکرام امام
احمد رضا، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء [2] احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ فی الحکمۃ المحکمہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۷۴ء ص ۱۶ [3] احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ، مطبوعہ
دہلی، ص ۶ [4] ظفر الدین بہاری: حیاتِ اعلیٰ حضرت، جلد اوّل، مطبوعہ کراچی، ص ۱۵۵ [5] محمد برہان الحق جبل پوری: اکرام امام احمد
رضا، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۰ء۔ [6] مقالہ مطبوعہ "صوت الشرق" (قاہرہ) شمارہ فروری ۱۹۷۰ء۔ [7] باربرا مٹکاف: ہندوستان
میں مسلم مذہبی قیادت اور علماء مسلمین (۱۸۶۰ - ۱۹۰۰) برکلے ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۵ [8] ابرار حسین مکتوب راقم الحروف، مکتوبہ ۱۹
اپریل ۱۹۸۰ء [9] ابرار حسین، مکتوب بنام راقم الحروف، مکتوبہ ۱۹ اپریل ۱۹۸۰ء [10] المیزان بمبئی: امام احمد رضا نمبر، مارچ
۱۹۷۶ء، ص ۳۹۱ [11] ایضاً، ص ۲۹۸۔ [12] ۳۰۱۔ مزید تفصیلات کے لیے ٹامس آرنلڈ اور الفرڈ گیام کی تالیف "میراثِ اسلام"
مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء مطالعہ کریں۔ [13] احمد رضا: حاشیہ مخطوطہ الدر المکنون، مخزونہ خالد علی خان، دار العلوم مظہر اسلام، بریلی، ص ۶۔
نوٹ: مولانا خالد علی خان کے کتب خانہ کے مخطوطات سے محترم سید ریاست علی قادری (سیلز منیجر پی۔ آئی۔ اے۔ کراچی) کی وساطت
سے استفادہ کیا گیا۔ موصوف ۱۹۷۹ء میں تقریباً چالیس قلمی حواشی بریلی سے لائے تھے۔ ان مخطوطات کے عکس شیخ مسعود احمد (ڈائریکٹر
فراج کیمیکل انڈسٹریز کراچی) کی عنایت سے راقم کو ملے۔ [14] احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ فی الحکمۃ المحکمہ مطبوعہ دہلی ص ۵۵۔ [15] (ا) احمد رضا
حاشیہ رسالہ لگارثم (۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء) قلمی ص ۲۳ (ب) احمد رضا: حاشیہ رسالہ علم مثلث کروی، قلمی، مخزونہ مولانا خالد علی خان،
دار العلوم مظہر اسلام، بریلی ص ۴۔ (ج) احمد رضا: حاشیہ جامع بہادر خانی، قلمی، مخزونہ مولانا خالد علی خان، دار العلوم مظہر اسلام
بریلی ص ۱۔ [16] (ا) احمد رضا: حاشیہ تحریر اقلیدس قلمی، دار العلوم مظہر اسلام، بریلی ص ۱۳ (ب) احمد رضا: حاشیہ بہادر خانی قلمی،
مخزونہ مولانا خالد علی خان در دار العلوم مظہر اسلام بریلی، ص ۱۴ [17] جامع بہادر خانی قلمی ص ۷ [19] حدائق النجوم، راجہ رتن سنگھ
بہادر ہوشیار جنگ زخمی کی تصنیف ہے۔ اسکا ایک مطبوعہ نسخہ (مطبع محمدی لکھنؤ ۱۲۴۱ھ) کتب خانہ خاص (انجمن ترقی اردو
کراچی) میں محفوظ ہے۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں جنکی تفصیل یہ ہے۔ (ا) جلد اوّل صفحہ ۱ تا ۳۸۶۔ (ب) جلد دوم صفحہ ۳۸۷
تا ۷۷۰ (ج) جلد سوم صفحہ ۷۷۱ تا ۱۱۵۸ [20] [21] ماہنامہ الرضا (بریلی) شمارہ ذوالحجہ ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء، ص ۲۵ [23] میر باقر
داماد استر آبادی (م ۱۰۴۱ھ / ۱۶۳۲ء) کی تصنیف الافق المبین کے جواب میں ملا محمد جونپوری نے خود اپنی کتاب الحکمۃ البالغہ
کی شرح شمس البازغہ کے نام سے لکھی۔ [24] احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۱۶ و حاشیہ ص ۸ [25] احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ
[26] احمد رضا: جامع بہادر خانی قلمی، ص ۴۔

مطبوعہ دہلی ص ۵۴ [۲۶] ابنِ سینا ۳۷۰ھ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اور ۴ رمضان المبارک ۴۲۸ھ ۱۰۳۷ء ۲۱ جون میں
ہمدان (ایران) میں انتقال کیا۔ اسلام کا مشہور دانشور جو ریاضی فقہ، ادب، ہندسہ، حیات، فلسفہ اور طب وغیرہ پر عبور رکھتا تھا۔
اس نے ۱۷، ۱۸ برس کی عمر میں شاہ بخارا کا علاج کیا۔ اور کتب خانہ شاہی کا انچارج ہوا۔ طب میں "القانون"، منطق و فلسفہ میں "الشفاء"
طبیعیات میں وسیع رسائل۔ اور ہندسہ میں ترجمہ اقلیدس اس کے یادگار ہیں [۲۷] احمد رضا۔ الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۴۴۔ [۲۸] احمد رضا
الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۷۔ [۲۹] احمد رضا۔ الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۳۸۔ [۳۰] احمد رضا۔ الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۴۷۔
[۳۱] احمد رضا۔ الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۹۹۔ [۳۲] مصنفہ عبدالرحمٰن ابنِ احمد الایجی (م ۷۵۶ھ)۔ [۳۳] مصنفہ سعدالدین مسعود بن محمد
تفتازانی (م ۷۹۱ھ)۔ [۳۴] مصنفہ نصیر الدین بن جعفر بن محمد طوسی (م ۶۷۲ھ)۔ [۳۵] مصنفہ عبداللہ بن محمد بیضاوی (م ۶۸۵ھ)۔ [۳۶]
مصنفہ عبداللہ بن محمد بیضاوی (م ۶۸۵ھ)۔ [۳۷] ماہنامہ الرضا بریلی شمارہ ذیقعد ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء ص ۳۹۔ [۳۸] تقریباً ۴۰۰ھ
قبل مسیح مشہور یونانی فلسفی، دیمقراطیس DEMOCRITUS نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مادہ چھوٹے چھوٹے اجزاء سے مرکب ہے۔ جب
یہ ملتے ہیں تو صورت نکلتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ان اجزاء کو تقسیم کرتے چلے جائیں تو ایک ایسا مرحلہ بھی آئیگا کہ مزید ٹکڑے کرنا
ناممکن ہوگا۔ اس سے جُزِ لایتجزیٰ (ایٹم) کا نظریہ ابھرا۔ یونانی زبان میں ایٹم کے معنی ہیں "ناقابلِ تقسیم" ۱۸۹۸ء میں جے جے ٹامسن نے
اس کے خلاف نظریہ پیش کیا اور کہا کہ ایٹم توڑا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں ردرفورڈ نے اس خیال کو توسیع دی اور کہا کہ ایٹم کا ایک
مرکز ہے جسکو نیوک لیس سے تعبیر کیا ہے اس میں نیوٹرون اور پروٹون موجود ہیں اور الیکٹرون نیوک لیس کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں
نیل بوہر نے کہا کہ الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون ایٹم کے حصے ہیں اور محور تبدیل کرتے وقت طاقت خارج کرتے ہیں۔
[۳۹] احمد رضا۔ الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۱۴۷۔ [۴۰] نیوٹن ایک غریب کسان کا لڑکا تھا۔ لندن سے ۱۰۰ کلومیٹر ایک گاؤں
(WOOLSTHORPE) میں ۲۵ دسمبر ۱۶۴۲ء کو پیدا ہوا۔ ۱۲ سال اسی گاؤں میں رہا اور ابتدائی تعلیم یہیں سے
حاصل کی۔ ۱۶۶۱ء میں کنگ اسکول سے میٹرک کیا۔ ۱۶۶۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ۱۶۶۹ء میں ریاضی میں
ایم اے کیا۔ ۱۶۷۲ء میں رائل سوسائٹی کا رکن منتخب ہوا۔ اور ۱۷۰۳ء میں صدر موصوف کا وزیر اعلیٰ بھی رہا۔ ۱۷۰۵ء میں ملکہ این
(ANNE) نے "سر" کا خطاب دیا۔ نیوٹن نے ۲۳ برس کی عمر میں ۱۶۶۵ء میں نظریہ "کششِ ثقل" پیش کیا۔ سیاروں کے
بیضوی محور کو دریافت کیا۔ تین اساسی اصولِ حرکت دریافت کیے۔ اختلافِ رنگ اور انتشارِ نور کا باہمی تعلق دریافت کیا۔ یہ بتایا
کہ سفید رنگ سات رنگ کی شعاعوں کا مجموعہ ہے۔ آواز کی رفتار دریافت کی اور عکسی اندازِ دوربین ایجاد کی۔ Differential Calculus
سے متعارف کرایا۔ اور Binomial Theorem ایجاد کی۔ ۲۰ مارچ ۱۷۲۷ء کو ۸۵ سال کی عمر میں نیوٹن کا انتقال ہو
اور لندن کے ویسٹ منسٹر گرجا میں رکھا گیا۔ نیوٹن کی دو کتابیں یادگار ہیں۔ (۱) الاصول (Principia) مؤلفہ ۱۶۸۵ء اور
(۲) النور (Optics) [۴۱] ماہنامہ الرضا بریلی شمارہ ذیقعد ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء ص ۳۶۔ [۴۲] ماہنامہ الرضا بریلی
شمارہ ذیقعد ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء ص ۴۰۔ [۴۳] آئن اسٹائن (Einstein) ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو مغربی جرمنی کے
مقام اولم میں پیدا ہوا۔ جب جرمنی سے نکلنا پڑا تو امریکہ چلا گیا۔ اور پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ریاضیات مقرر ہوا۔ امریکہ
میں جوہری توانائی کا کام اسی کے کہنے پر شروع کیا گیا۔ اس نے طبیعیات میں گرانقدر دریافتیں کیں اور نظریہ اضافیت پیش کیا۔

۱۹۵۲ء میں امریکہ میں اسکا انتقال ہوا۔ ۴۲؎ احمد رضا: معین مبین بہر دور شمس و سکون زمین (۱۹۱۹ء) قلمی ص ۱۰۴۔
۴۳؎ پروفیسر البرٹ الیف پورٹا کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ مشیگن یونیورسٹی (امریکہ) سے متعلق تھا لیکن بعض کا کہنا ہے کہ یہ یونین یونیورسٹی (رائٹی) میں پروفیسر رہا۔ بہر حال یہ سان فرانسکو (امریکہ) کے ماہر ثوابت (Meteorological) کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ تفصیلات کے لیے مطالعہ کریں نیویارک ٹائمز (امریکہ) شمارہ ۱۶ و ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ ۴۴؎ نواب صاحب سے مراد نواب وزیر احمد خان صاحب ہیں۔ ۴۵؎ ظفر الدین بہاری: حیات اعلیحضرت، جلد اول مطبوعہ کراچی ص ۲۹۰۔ ۴۶؎ اس رسالے کا مخطوطہ جامعہ راشدیہ (پیر گوٹھ) سندھ کے شیخ الجامعہ مولانا تقدس علی خان صاحب کے پاس محفوظ ہے جس کا عکس محترم سید ریاست علی قادری صاحب (سیلز منیجر۔ ٹی، آئی، پی) کراچی کی عنایت سے ملا۔ اب یہ رسالہ مرکزی مجلس رضا، لاہور نے شائع کر دیا ہے۔ نیز اخبار جنگ (کراچی) شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء اور اخبار افق (کراچی) شمارہ ۲۲ جنوری ۱۹۸۰ء میں بھی شائع ہو گیا ہے۔ ۴۹؎ احمد رضا: معین مبین بہر دور شمس و سکون زمین (۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) قلمی ص ۱۸، صفحہ آئندہ۔ ۵۰؎ کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) کی فاضلہ ڈاکٹر باربرا مٹکاف کی عنایت سے ان شماروں کے تراشے ملے۔ راقم ان کا ممنون ہے۔ ۵۱؎ نیویارک ٹائمز (امریکہ) شمارہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ ۵۲؎ نیویارک ٹائمز (امریکہ) شمارہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ ۵۳؎ نیویارک ٹائمز (امریکہ) شمارہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۹ء۔ ۵۴؎ یہ رسالہ پہلے ماہنامہ الرضا بریلی میں قسط وار شائع ہوا۔ ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کے شمارے میں ایک قسط نظر سے گزری ص ۳۸ تا ۴۰۔ دوسری قسط ذوالحجہ ۱۳۳۸ھ کے شمارے میں مطالعہ کی (ص ۱۰ تا ۱۴) پہلے شمارے میں رد حرکت زمین پر ۲۲ سے ۲۵ دلائل ہیں۔ اور دوسرے شمارے میں ۲۵ سے ۳۳ تک۔ دلائل کی کل تعداد ۱۰۵ تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دونوں شماروں میں کل مقالے کا عشر عشیر بھی نہیں۔ شیخ الجامعہ راشدیہ سندھ مولانا تقدس خان صاحب نے فرمایا کہ ماہنامہ الرضا کے صفحات پر رسالے کا ایک حصہ شائع ہوا تھا جسکا فائل ان کے پاس محفوظ تھا جو کہ اب بنگلہ دیش میں ایک صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ رسالہ کا اصل مخطوطہ ۲۵۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ جو امام احمد رضا کے صاحبزادے مفتی محمد مصطفٰے رضا خان صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ خواجہ رضی حیدر سے معلوم ہوا کہ غالباً ایک مخطوطہ ماریشس میں مولانا محمد ابراہیم خوشتر کے پاس بھی تھا۔ حسن اتفاق کہ محمد یوسف صاحب میمن جن کے پاس الرضا کا فائل ہے، مقالے کی تیاری کے بعد مورخہ ۷ نومبر ۱۹۸۰ء کو کراچی میں راقم سے ملنے آئے اور فرمایا کہ فائل بنگلہ دیش میں محفوظ ہے۔ ۵۵؎ احمد رضا: الکلمۃ الملہمہ مطبوعہ دہلی ص ۵۔ (نوٹ) نظریہ حرکت زمین میں اختلاف کی گنجائش معلوم ہوتی ہے چنانچہ پاکستان کی ایک خاتون سائنس دان زہرا مرزا قادری نے اختلاف کیا ہے جس کو اخبار جنگ (کراچی) شمارہ ۱۱ مئی ۱۹۸۰ء نے نقل کیا ہے۔ زہرا قادری کو کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) میں اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کے لیے دعوت بھی دی گئی تھی۔ ۵۶؎ یہ کتاب ۱۹۷۴ء میں دہلی میں چھپ کر میرٹھ میں شائع ہو گئی ہے۔ ۵۷؎ پروفیسر حاکم علی انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے بانیوں میں تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ریاضی کے مشہور پروفیسر اور بعد میں پرنسپل رہے ۱۹۲۰ء میں کالج سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا۔ تحریک ترک موالات کے زمانے ۱۴ صفر ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء میں انہوں نے امام احمد رضا سے فتویٰ لیا اور اسی پر عمل کیا۔ پروفیسر حاکم علی صاحب کے تلامذہ پرنسپل دار العلوم لسنۃ الشرقیہ پروفیسر بیدار بخت نہایت ممتاز ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مولانا حاکم علی مرحوم ریاضی میں اسقدر ماہر تھے کہ کلاس روم میں بڑے

استمداد سے بغیر کسی کتاب کے گھنٹوں پڑھاتے رہتے۔ اقبال احمد فاروقی:۔ تذکرہ علمائے اہلسنت لاہور مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء ص ۸۹ سے ۵۸ احمد رضا:۔ نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان مطبوعہ لکھنؤ۔ ص ۱۷،۱۴۔ ۵۹ امام احمد رضا کا طریقہ استدلال یہ ہے کہ مخاطب اپنے دعویٰ کے ثبوت کیلیے جس فن کی کتابوں سے دلائل پیش کرتا ہے اسی فن کی کتابوں سے اسکا رد کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ ہر مقام پر اپنا علمی تبحر قائم رکھتے ہیں۔ ۶۰ احمد رضا:۔ نزول آیاتِ فرقان بسکون زمین و آسمان مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۳۔ ۶۱ احمد رضا:۔ نزولِ آیاتِ فرقان بسکون زمین و آسمان مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۳۔ ۶۲ احمد رضا نزول آیات فرقان بسکون زمین و آسمان مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۴۔ ۶۳ رفیع اللہ صدیقی:۔ فاضل بریلوی کے معاشی نکات مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء ص ۱۴۰،۱۳۰۔ (نوٹ) ۱۹۱۲ء میں امام احمد رضا نے یہ نظریہ پیش کیا پھر بہت بعد ۱۹۲۶ء میں کینز (Keynes) نے یہ نظریہ پیش کرکے انگلستان کا اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کیا۔ ۶۴ انگریزی نظام تعلیم نے ہم کو فارسی و عربی سے بیگانہ کرکے ماضی سے منقطع کردیا۔ ہم علمائے دین کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اور اسکا احساس نہیں کہ انہوں نے ہم کو ہمارے شاندار ماضی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ آزاد جموں و کشمیر یونیورسٹی قابلِ مبارک باد ہے کہ اس نے اپنے یہاں عربی اور اسلامی کلچر کو لازمی مضامین کی حیثیت دی ہے۔ ۶۵ ظفر الدین بہاری:۔ حیاتِ اعلیحضرت۔ جلد اوّل ص ۱۵۲۔ ۶۶ محررہ ۱۹۷۹ء۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اعلیٰحضرت کی نعتیہ شاعری
سادگی اور پرکاری کی ایک مثال

ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب علمی اور ادبی دنیا میں جس حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ تعارف کی محتاج نہیں۔ ادارہ معارف رضا ڈاکٹر صاحب کا شکرگزار ہے کہ موصوف نے فاضل بریلوی قدس سرہ کی نعتیہ شاعری کے سلسلہ میں ایک بصیرت افروز مقالہ عطا فرمایا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اب تک فاضل بریلوی قدس سرہ کو صرف ایک عالم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا لیکن اب یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ فاضل بریلوی صرف ایک عالم دین ہی نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت ایسی ہشت پہل تھی جس کے جس پہلو پر نظر ڈالی جائے ہر جانب علم و فضل روحانیت اور ملی خدمات نظر آئیں گی۔ زیر مقالہ بھی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ فاضل بریلوی کے علمی کارنامے مدارس اور مساجد تک ہی محدود نہیں بلکہ موجودہ دور کے قابل قدر محقق اور ادیب بھی ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے معترف ہیں ـــــــــ محمد اطہر نعیمی

شاعری خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، شاعر سے جذبے کی شدت اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبے کی شدت اور پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے موضوع پر مخلص ہو۔ گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور اپنی لگن میں سچا ہو۔ اس سچائی اور لگن کو غالب نے "دلِ گداختہ" کا نام دیا ہے۔ اقبالؔ نے خونِ جگر کہا ہے اور بعض نے شاعر کے خلوص سے تعبیر کیا ہے جس نسبت سے شاعر کے جذبات سچے، ملتہب اور گہرے ہوں گے۔ اسی نسبت سے اس کی شاعری سچی، موثر اور گہری ہوگی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جذباتی صداقت کے بغیر محض منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ کسی شخص کا علمی تجربہ اس کا تامل و تفکر اور مشاہدہ و مطالعہ ممکن ہے۔ لیکن تخلیق شعر میں معاون نہیں ہوسکتا۔ خاص طور پر نعتیہ شاعری علم و فکر کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذباتِ محبت کا ایسا ارتعاش و التہاب چاہتی ہے جو مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی طرح اس بات پر والہانہ یقین رکھتا ہو کہ آنحضرت کی ذات گرامی کائنات میں بے مثل ہے۔ نہ ماضی میں اس کی مثال نظر آتی ہے۔ نہ حال میں اور نہ مستقبل میں اس کی مثال کا امکان ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی شاعر پورے وثوق مکمل یقین اور پوری شدتِ جذبات کے ساتھ یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو۔

لم یات نظیرک فی نظر، مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

اور جب تک اس عقیدے پر عامل نہ ہو اس وقت تک نہ تو کوئی شاعر صف اول کا نعت گو شاعر کہا جاسکتا ہے۔ نہ اس کی نعتیہ شاعری دوسروں کو مسحور و متاثر کرسکتی ہے اور نہ اس میں وہ شگفتگی و دلآویزی پیدا ہوسکتی ہے جو مندرجہ بالا شعر میں نظر آتی ہے۔ اس شعر میں یا اس نعت کے دوسرے اشعار میں جو اثر آفرینی اور دلکشی ہے۔ وہ صرف اس سبب سے نہیں کہ اس میں مولانا احمد رضا خان صاحب نے غیر معمولی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے اور ہر شعر میں عربی، فارسی،

اردو اور پوربی یوپی کی فنکارانہ پیوندکاری سے ادب کے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ زبان و بیان کے سلسلے میں اس نوع کی قادر الکلامی دوسرے شعرا کے یہاں بھی ملتی ہیں بلکہ اردو شاعری کی تاریخ میں الفاظ کی شعبدہ گری صنائع لفظی میں کمال دکھانے والے شاعر بہت سے ہیں لیکن صاحب نقد و نظر خوب واقف ہیں کہ محض کمالات لفظی کی بنا پر انہیں بڑا شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، ذوق و غالب، امیر و داغ، میر حسن اور پنڈت دیاشنکر نسیم کے نام ہماری تاریخ میں ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان تقابلی مطالعات پر درجنوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ طلبہ سے لیکر اساتذہ تک ان کی شاعرانہ خصوصیات کا موازنہ کرتے رہتے ہیں لیکن کوئی صاحب ذوق اور انصاف پسند ناقد سودا کو میر پر، ناسخ کو آتش پر، ذوق کو غالب پر، امیر کو داغ پر اور نسیم کو میر حسن پر ترجیح نہیں دے سکتا حالانکہ زباندانی اور لفظی صناعی کے جتنے کرتب سودا، ناسخ، ذوق، امیر اور نسیم کے یہاں دکھائے گئے ہیں میر، غالب، آتش، داغ اور میر حسن کے یہاں نظر نہیں آتے۔ یہ اس کا بین ثبوت ہے کہ شاعری کا حقیقی تعلق الفاظ و تراکیب سے نہیں، جذبات و محسوسات کی سچائی اور گہرائی سے ہے چنانچہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی مذکورہ بالا نعت میں بھی جو دل نشینی و دلآویزی اور لطافت و پاکیزگی ہے وہ اس بنا پر آنحضرت سے بے پناہ محبت کا صاف و شفاف چشمہ اس کی تحت میں بہہ رہا ہے مستی اور والہانہ پن کا ایک آبشار ہے جس کی طراوت، خنکی اور مٹھاس سے اہل دل سیراب ہو رہے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا اور یہ نعت محض لفظی صناعی کا ایک نمونہ ہوتی تو ہرگز زبان زد خلائق نہ ہوتی۔ اس کی مقبولیت حلقۂ خواص سے نکل کر عوام تک نہ پہنچتی اور اس کے اشعار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے سوا کوئی اور لطف نہ لے سکتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کوئی شخص اس کے الفاظ کو پوری طرح سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ اس میں جذبات

کی ایسی شدت، ایسی صداقت اور ایسی گہرائی ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں کے دل خود بخود اس طرف کھنچتے ہیں اور جب کسی محفل یا جلسے میں یہ نعت خاص لحن میں پڑھی جاتی ہے۔ سامعین خواہ ان کی علمی ادبی سطح کچھ بھی ہو، وجد میں آ جاتے ہیں۔ جھوم جھوم اٹھتے ہیں اور خود کو حضور اکرم کی بارگاہ میں حاضر محسوس کرنے لگتے ہیں دلکشی اثر پذیری کا جادو اس نعت سے حضرت رضا بریلوی کی جذباتی صداقت نے جگایا ہے۔ ورنہ سچ بات یہ ہے کہ انہیں مختلف زبانوں کی پیوندکاری اور الفاظ و تراکیب کا شعبدہ دکھانا مقصود نہ تھا۔ ایک فطری اور خلاق شاعر کی حیثیت سے وہ پوری طرح محسوس کرتے اور ایک باشعور ناقد کی طرح خوب جانتے تھے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری الفاظ سے نہیں بلکہ درون خانہ کے ہنگاموں یعنی شدید جذباتی تلاطم اور تموج سے وجود میں آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری ایک طرح کا عمل ہو کر بھی سراسر شعوری عمل نہیں ہے۔ شعر کہے نہیں جاتے، بنائے نہیں جاتے۔ شعر کے لئے الفاظ جوڑے نہیں جاتے۔ قافیے تلاش نہیں کیے جاتے استعارات و کنایات اور تراکیب و محاورات دانستہ تراشے نہیں جاتے بلکہ شعر اپنے پورے وجود کے ساتھ خود بخود ذہن شاعر پر نازل ہوتا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے اور حقیقی شاعر نے شعر گوئی کے سلسلے میں یہی کہا ہے اور حضرت رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری بھی اسی خاص معیار پر پوری اترتی ہے، ہرچند کہ جس نعت خاص کا ذکر اس جگہ کیا گیا۔ وہ احباب کی فرمائش پر کہی گئی ہے اور جیسا کہ اس نعت کے مقطع میں ہے ؎

بس خامۂ خام نوائے رضا نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

مولانا احمد رضا خان صاحب نے خود واضح کر دیا ہے۔ نہ تو ان کا یہ رنگ سخن تھا اور نہ اس طرز شاعری سے ان کی طبیعت

کو کوئی مناسبت تھی ۔ صرف احباب کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے ایسا کیا اور اپنی غیر معمولی قادر الکلامی کا لوہا منوایا ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری بنیادی طور پر فلسفیانہ موشگافیوں یا علم و فن کے بھول بھلیوں کی شاعری نہیں بلکہ حضور اکرم ؐ کی ذات و صفات سے گہری وابستگی اور شدید جذباتی لگاؤ کی شاعری ہے ۔ ان کی نعتیہ شاعری معصومیت شیفتگی سادگی اور عاشقانہ سرمستی کی جو چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور یہ چاندنی قاری کے دروں خانہ میں جس قسم کا مد و جزر پیش کرتی ہے وہ بے سبب نہیں ہے ۔ جذبات اپنے اظہار و ابلاغ میں کسی خاص قسم کی لفات، تراکیب اور استعارات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ فطری انداز میں روزمرہ کی زبان میں انتہائی سادگی سے خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں حقیقی جذبہ، خواہ اس کا تعلق محبت سے ہو یا نفرت سے، خوف سے ہو یا جستجو سے، غم سے متعلق ہو یا خوشی سے، مصنوعی سہاروں کا محتاج نہیں ہوتا ۔ اپنے نمود و اظہار کی راہ خود پیدا کر لیتا ہے لیکن بعض اوقات تو جذبے کے اظہار کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ آدمی کے چہرے بشرے رفتار حرکات و سکنات اور نشست و برخاست سے جذبات خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے گہرے اور سچے جذبات کی عشقیہ شاعری خواہ اس کا تعلق مجاز سے ہو یا حقیقت سے اپنی تفہیم ترسیل کے لئے کسی لغت یا شرح کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود بخود عام و خاص ہر قسم کے قاری اور سامع ذہن و قلب میں اتر جاتی ہے ۔ مجازی سطح پر اردو شاعری کی تاریخ میں میر تقی میرؔ کی عشقیہ شاعری اس کی ایک واضح مثال ہے ۔ عشق رسول ؐ اور نعت گوئی کے حوالے سے یہی صورت مولانا احمد رضا خان صاحب کی شاعری کی ہے جس طرح ان کے جسم کا رُواں رُواں آنحضرت کی محبت سے سرشار ہے اسی طرح ان کی نعتیہ شاعری کا ایک ایک لفظ عشق رسول ؐ میں ڈوبا ہوا ہے اور حضور اکرم ؐ سے گہرے جذباتی لگاؤ کا مظہر ہے ۔ اس لئے حضرت بریلوی کی نعتیہ شاعری جتنی زیادہ سادہ ہے ۔ اتنی ہی زیادہ پرکار ہے اور اپنے قاری اور سامع کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی اور رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی خود عاشقان رسول ؐ میں تھے ۔ انہوں نے اچھے شعر کے متعلق حکم لگایا ہے کہ ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
دل میں سنتے ہی جو اتر جائیں

مولانا احمد رضا خان صاحب کی نعتیہ شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ جو شخص ان کے اشعار سنتا ہے، سر دھنتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ اپنے ذوق سخن کا مذاق اڑواتا ہے عاشقانہ جذبات نے اظہار میں سادگی و پاکیزگی کا جو رچاؤ شروع سے آخر تک حضرت رضا بریلوی کی مجموعہ نعت حدائق بخشش میں نظر آتا ہے اور اردو کے دوسرے نعت گو شعراء کے یہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے ۔ ان کے یہاں غزل کے پیرائے میں لمبی لمبی نعتیں ملتی ہیں اور بعض نعتوں میں بڑی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے لیکن آنحضرت ؐ کی محبت کا تیز دھارا سنگلاخ زمینوں کو چیرتا ہوا اس طرح گزر گیا ہے کہ شادابی و زرخیزی کے جو آثار مولانا احمد رضا خان صاحب کی ان نعتوں میں پیدا ہو گئے ہیں ۔ وہ دوسروں کے ہاں نرم اور ہموار زمینوں میں بھی نظر نہیں آتے ۔ میری مراد ایسی نعتوں سے ہے جن میں بعض کے مطلعے اس انداز کے ہیں کہ :۔

سر تا بقدم ہے تن سلطان زمن پھول
لب پھول، دہن پھول، ذقن پھول، بدن پھول

عارض شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں
عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوشتر ایڑیاں

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں

کینہ کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں
یادِ وطن ستم کیا دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بد نصیب سر پہ بلا اٹھائی کیوں

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

ان زمینوں میں اچھے شعر کہنا وہ بھی نعت میں جس میں قدم اٹھانا بقول عرفی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ ہر شخص کی بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جسے توفیق الٰہی میسر ہو اور عشقِ رسول کی سرشاری و سرمستی کے ساتھ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت بھی رکھتا ہو برصغیر پاک و ہند کے علمائے دین میں بڑے بڑے صاحبِ علم و دانش اور علوم دینی و دنیوی کے فاضل گزرے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک معتبر و متبحر عالم و فقیہہ ہوتے کے ساتھ ساتھ صفِ اول کا شاعر بھی ہو یا جس نے نعت گوئی میں کوئی ممتاز مقام پیدا کیا ہو اس اعتبار سے مولانا احمد رضا خان کی شخصیت بالکل منفرد اور یکتا ہے وہ برصغیر کے ایک ایسے جیّد عالم ہیں جن کا حلقۂ اثر دوسرے علماء کے مقابلے میں سب سے بڑا ہے اور ایک ایسے نعت گو شاعر ہیں جن کی نعتیں نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مقبول ہیں بلکہ ان کی شاعری اس پایہ کی ہے کہ ان کا نام صرف اردو کے ممتاز ترین شاعروں کے نام کے ساتھ لیا جانا چاہیئے۔

جہاں تک خالص نعتیہ شاعری کا تعلق ہے۔ اردو میں جو قبولِ عام مولانا احمد رضا خان صاحب کی شاعری کو میسر آیا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کے ہم عصروں میں محسن کاکوروی کا نام یقیناً ایسا ہے جن کا معیارِ نعت گوئی کم و بیش وہی ہے جو رضا بریلوی کی نعتوں کا ہے۔ لیکن محسن کاکوروی کے مجموعۂ نعت میں سے صرف ایک قصیدہ لامیہ اور مثنوی ابرِ کرم ہی کو مقبولیت حاصل ہو سکی۔ ان نظموں سے بھی صرف اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ ہی متعارف ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں زبان و بیان کے سلسلے میں علامات و استعارات کا جو اہتمام اور معیار پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس سے خاص خاص لوگ ہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس رضا بریلوی کی نعتیں اپنی مخصوص سادگی و پرکاری کے سبب عام و خاص میں یکساں مقبول ہیں۔ ہمارے ہاں ان کی نعتیں مخصوص محفلوں سے لیکر سیرت[۲۰،۱۱] کے عام جلسوں تک بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا باذوق مسلمان ہوگا جسے رضا بریلوی کی مندرجہ نعتوں کے دو چار شعر نہ یاد ہوں ؎

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

لم یات نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

نعتیہ غزلوں سے قطع نظر مولانا احمد رضا خان صاحب کا سلام جس کا مطلع ہے ؎

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اکبر وارثی میرٹھی کا سلام ؎

یا نبی سلام علیک　　یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک　　صلوٰۃ اللہ علیک

بھی حد درجہ شہرت رکھتا ہے۔ مرد عورت، بچے جوان سبھی بلند آواز پڑھنا پسند کرتے ہیں لیکن اس کے بعد اگر کسی قبولِ عام کا درجہ ملا ہے تو وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب سلام ہے۔ حفیظ جالندھری کے شاہنامے کا ایک ٹکڑا جس میں ولادتِ نبوی کا ذکر ہے اور ماہر القادری کی نظم حدیثِ قدسی، جس میں آنحضرت پر درود و سلام بھیجا گیا ہے۔ کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت دنوں تک ہر محفل اور ہر جلسے میں پڑھے گئے لیکن نہ جانے کیوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ ان کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اب وہ کسی محفل میں شاذ ہی سننے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا احمد رضا خاں صاحب کو سلام ڈیڑھ سو اشعار پر مشتمل ہے اور حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں سے قدیم تر اور طویل تر ہے۔ پھر بھی آج تک بڑے اہتمام اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب ممتاز ترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین نعت گو شاعر بھی ہیں۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
جو ترے در سے یار پھرتے ہیں
در بدر یوں ہی خوار پھرتے ہیں
آہ! کل عیش تو کیے ہم نے
آج وہ بے قرار پھرتے ہیں
اس گلی کا گدا ہوں جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں
ہر چراغِ مزار پر قدسی
کیسے پروانہ وار پھرتے ہیں
پھول کیا دیکھوں میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں
لاکھوں قدسی ہیں کارِ خدمت میں
لاکھوں گردِ مزار پھرتے ہیں
رکھیے جیسے ہیں خانہ زاد ہیں ہم
مول کے عیب دار پھرتے ہیں
ہائے غافل وہ کیا جگہ ہے جہاں
پانچ جاتے ہیں چار پھرتے ہیں
بائیں رستے نہ جا مسافر سن
مال ہے راہ مار پھرتے ہیں
جاگ سنسان بن ہے رات آئی
گرگ بہرِ شکار پھرتے ہیں
کوئی کیوں پوچھے تیری بات رضاؔ
تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

اعلیٰحضرت بریلوی

رسالہ درِ علم لوگارثم کے چند حواشی

از ۔ پروفیسر محمد ابرار حسین ۔ اسلام آباد۔

محترمی جناب ابرار حسین صاحب کا تعلق علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ہے۔ زیرِ نظر مضمون رسالہ لوگارثم کے مفصل مقالہ کی تلخیص ہے۔ موصوف اس مقالہ کی نوک پلک درست فرما رہے ہیں۔ جو بعد میں ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔ ادارہ معارف رضا ابرار حسین صاحب کا ممنون ہے کہ انہوں نے انتہائی عجلت میں زیرِ منظور مضمون عطا فرمایا ——————— سید محمد ریاست علی قادری

امام احمد رضا کو کم و بیش چپن علوم پر دسترس حاصل تھی۔ ان میں سے تقریباً ۴۳ علوم و فنون انہوں نے ذاتی مطالعے سے حاصل کیے۔ علوم ریاضی میں ان کی حیثیت مسلّم ہے۔ مولانا ظفر الدین بہاری کی مرتبت کردہ فہرستِ تصانیف اعلیٰحضرت میں تہتر کا تعلق عام ریاضی سے جنکی تفصیل اسطرح ہے

زیجات ۷

جبر و مقابلہ ۴

علمِ مثلث، ارثماطیقی، لوگارثم . ۸

توقیت، نجوم، حساب . . . ۲۲

ہیئت، ہندسہ، ریاضی . . ۳۱

یہ تصانیف کتب، رسائل، مقالات، اور حواشی پر مشتمل ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ علم کا یہ بے بہا ذخیرہ ابھی تک طباعت کا منتظر ہے۔

سید ریاست علی قادری کا یہ کارنامہ قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے رسالہ در علم لوگارثم شائع کر کے دوسروں کو دعوتِ فکر و عمل دی ہے۔

ریاضی اور سائنس کے بیشتر طلباء چیمبرز (CHAMBERS) کے ریاضیاتی جداول سے شناسا ہیں۔ ۴ اعشاریہ، ۵ اعشاریہ، ۷ اعشاریہ کے جداول عام دستیاب ہیں۔ اس ادارے نے ۱۸۷۸ء میں "چیمبرز تعلیمی نصاب" کے سلسلے میں بڑے جامع جداول شائع کیے جنکا سرورق کچھ اسطرح ہے۔

Mathematical Tables
consisting of
Logarithms of Numbers
1 to 100000
Trigonometrical Nautical
& other Tables
Edited by

James Pryde F.E.I.S
W & R Chambers Ltd.,
London & Edinburg
1878

۱۸۹۴ء میں اسکا نیا ایڈیشن شائع ہوا جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی نظر ثانی (Walter F. Robinson) نے کی اور ادارت (Archibald Milne) نے کی۔

جداول کے شروع میں ان کی تشریحات تحریر کی گئی ہیں اور رسالہ در علم لوگارثم ان ہی تشریحات کا اردو ترجمہ ہے۔

۱۸۹۴ء ایڈیشن میں ۶۸ جداول ۴۵۴ صفحات پر دیے گئے ہیں اور تشریحات کے ۴۲ صفحات ہیں۔ ترجمے میں ۴۶ جداول کی تشریحات ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ اولین ایڈیشن کا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے ایڈیشن میں تشریحات میں کہیں کہیں اضافہ کیا گیا ہے۔

صاحب ترجمہ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ اعلیحضرت کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے بغور اسکا دو تین مرتبہ مطالعہ کیا اور جگہ جگہ حواشی میں اپنے تاثرات درج فرمائے۔ ان حواشی میں مزید تشریحات کی گئی ہیں۔ متبادل مگر سہل طریقوں کو بتایا گیا ہے۔ اور کچھ اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

ان حواشی سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیحضرت کو لوگارثم، علم مثلث اور متعلقہ علوم پر زبردست مہارت حاصل تھی۔ اس میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیحضرت نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں مغربی کتب سے علوم ریاضی کا اکتساب نہیں کیا لیکن وہ جدید اور قدیم ریاضی سے بخوبی واقف تھے۔ لوگارثم کی ایجاد تو سولہویں صدی میں ہوئی لیکن اسکا استعمال کم ازکم اس خطہ زمین پر بہت محدود تھا۔ پہلی مرتبہ کالج میں جاکر ہی لوگارثم کا پتہ چلتا تھا۔ اب چند سالوں سے اسے اسکول کے نصاب میں شامل کرنے کا ناکام تجربہ کیا گیا ہے لوگارثم کا مقام اس زمانے میں وہی تھا جو آج کیلکولیٹر کا ہے۔ اعلیحضرت نے لوگارثم کا استعمال ہر اس جگہ کیا ہے جہاں ضروری سمجھا: فتاویٰ رضویہ جلد اول صفحات ۳۳۱ تا ۳۳۰، باب المیاہ میں آپ کا مشہور فتاویٰ ہے "مسمی با النہی الخیر فی الماء المستویہ" درج ہے۔ یہ آپ نے ۱۳۲۴ھ میں دیا۔ اس میں آپ نے لوگارثم استعمال کیے ہیں۔

زیر نظر حواشی ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں کیے گئے۔ صفحہ ۴۳ پر آپ نے اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ اور تاریخ ۲۶ شوال ۱۳۲۵ء بھی درج فرمائی۔ ان حواشی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے لوگارثم پر ایک کتاب بھی تحریر فرمائی ہے۔ صفحہ ۱۹ کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں (جیسا کہ متن کا آخر میں ہے)" اسکا بیان ہم نے لوگارثم کی کتاب سوم صفحہ ۵۶ و ۵۷ پر لکھا ہے"۔ تمام حواشی کے بارے میں تبصرہ اس لیے ممکن نہیں کہ عام قاری کے لیے ریاضیاتی تفاصیل بھی باعث ثقل ہوں گی۔ اس لیے ہم صرف ان حواشی کو لیں گے جو صفحات ۱۹ تا ۲۳، چھوٹی قوسوں کے قاعدے پر دیئے گئے ہیں۔

صفحہ ۱۹ پر تین بڑے حواشی درج ہیں۔ پہلے میں آپ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ چھوٹے قوسوں کے لیے علیحدہ قواعد کی کیوں ضرورت ہے۔ آپ نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ نہایت چھوٹی قوسوں میں تنگی اعشاریہ کے باعث جیوب کے بعض روالح کا فرق دیتے ہیں۔

قوس صغیرہ کی لوگارثمی جیب مستوی معلوم کرنے کے طریقہ کتاب میں اسطرح بتایا گیا ہے:۔

"قوس کی لوگارثم ہیں جس کی تحویل ثوانی ؎۱ کی طرف کی گئی ہو۔ ۴۶۱۸۵۵۷۴۹ ۰ جمع کرو۔ حاصل جمع سے اس کی لوگارثمی سیکنڈ کا ۱/۲ تفریق کرو۔ اس آخر لوگارثم کا قوت نما بقدر دس کے پیشتر سے کم کیا گیا ہے، حاصل تفریق جیب مستوی مطلوبہ ہوگی۔"

اعلیحضرت نے اوپر دیئے ہوئے عدد مدام کے بارے میں فرمایا۔

"دانی کہ ایں از کجا ابد"

اور پھر خود ہی جواب دیا:

"ایں لوگارثم جیب ظل یک ثانیہ است" ؎۴

دوسرا حاشیہ طریقہ مذکورہ پر دیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

"بایں طریق لوح گرفتن ازاہم اوق است کہ جیب اصلی بتعدیل مابین السطرین گرفتہ بہ لوگارثم برند"

اس کی وضاحت ایک مثال ؎۶ سے فرمائی ہے اور مزید اس حاشیے میں چار طریقوں کا موازنہ فرمایا ہے۔

(۱) جدول کے ذریعے بین السطرین لوگارثم کو معلوم کرنا۔

(۲) کلیہ مذکورہ سے۔

(۳) جدول سے جیب قوس معلوم کرکے اس کی لوگارثم لی جائے۔

(۴) جیب کی اصل قیمت پھیلاؤ کے ذریعے معلوم کرکے اس کی لوگارثم لی جائے اور یہی سب میں افضل ہے۔

تیسرا حاشیہ اس کلیے کے بارے میں جو اوپر درج کیا گیا ہے اصل کتاب میں اسکا ثبوت نہیں دیا گیا۔ ۱۸۹۴ء ایڈیشن میں صرف Woodhouse کی geometry کے صفحہ ۲۶۲ کا حوالہ دیا گیا ہے ۱۹۳۰ء کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں ضرور اس کی مزید تشریح کی گئی ہے۔

اعلیحضرت رقم طراز ہیں

"حاصل ایں عمل آں است کہ ؎۵

$$\frac{\text{عدد ثوانی قوس} \times \text{جیب یک ثانیہ}}{\text{جزء الکعب قالمع محظ قوس}} = \text{جیب قوس}$$

کتاب میں دیئے گئے کلیئے کے استعمال میں تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ قاعدہ صرف بہت چھوٹی قوسوں کے بارے میں ہے اور ہم اسے آگے لے جائیں تو۔

؎۱ اس زمانہ میں علم مثلث میں زاویے کی جگہ قوس کا لفظ مستعمل تھا۔ مثلثی تناسب دائرہ کے حوالے سے ہی حاصل کیے جاتے تھے۔ اصل کتاب میں بھی لفظ (Arc) ہے ؎۲ (Sexagesimal sines) ؎۳

؎۴ seconds

؎۵ اس کی دلیل اسطرح دی ہے کہ بہت چھوٹے زاویوں کے لیے $\sin\theta \simeq \theta$ اور $\sin 1'' \simeq \frac{\pi}{180\times60} \times \frac{1}{60} \simeq \frac{\sin 1'}{60}$ اسلئے $1'' = \log\sin 1' - \log 60$؛ $6.4637261 - 1.7781513 = 6.6855749$

؎۶ آپ نے مثال کے لیے زاویہ ۱' ۲۰'' لیا طریقہ اوّل سے لوجیب ۱' ۲۰'' = 4541224111، طریقہ دوم سے 4.54398174، طریقہ سوم سے 6560398847 اور طریقہ چہارم سے 4560398174

"۴۰ درجے پر جیب میں ۳۰، کی کمی ہوگی، ۵ پر ۵ کی ۶ پر ۱۱ کی، ۷ پر ۲۲ کی، ۸ پر ۳۶ کی، ۹ پر ۵۹ کی، ۱۰ پر ۹۰ کی، ۶۰ درجے پر ۳۵۴۸۷۸۱ کی تو قاعدہ برابر نہیں۔

اس کے بعد آپ نے ایک سہل طریقہ بیان فرمایا۔

"ثم اقول بلکہ ایک ثانیہ سے ایک سو بیس ثانیے تک نہ اوس تطویل کی حاجت ہے نہ اس تدقیق کی ضرورت بلکہ لوگارثم جیب یک دقیقہ لوگارثم ۶۰ کو تفریق کریں لوگارثم یک ثانیہ ہو جائے گا۔ اس میں دو کا لوگارثم جمع کرنے سے لوجیب ۲ ثانیہ ۳ کا لوملانے سے لوج ۳ ثانیہ۔ بعد کو نظر کی تو یہ وہی عدد عام ہے جو لوگارثم ثوانی میں جمع کیا جاتا ہے"[7]

صفحہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ پر دیے ہوئے حواشی میں آپ نے اپنے دیے ہوئے طریقے کا موازنہ دوسرے طریقوں سے کیا ہے۔ مثالوں سے اپنے حساب کی اقربیت پاکر یہ نتیجہ نکالا ہے:۔

"ہمارا حساب ادق بھی ہے اور لیسر بھی"

اعلیحضرت کا بیان کردہ طریقہ انتہائی سہل ہے۔ زاویہ کے ثوانی بنا کر اس کی لوگارثم میں 4.6855749 جمع کرنے سے لوجیب حاصل ہو جاتی ہے جبکہ کتاب میں درج کلیے میں عمل طویل ہے اور تفاوت زیادہ۔[8]

اعلیحضرت کا طریقہ ۱۲۰ ثوانی سے بھی اوپر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں فرق ساتویں اعشاریہ پر پھر چھٹے پر اور اسی طرح ۱ درجہ ۹ ے پر چوتھے اور ۲ درجے پر تیسرے اعشاریہ تک نتیجہ صحیح ملے گا۔

ان چند حواشی کے بغور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیحضرت کو علم مثلث اور لوگارثم پر زبردست عبور حاصل تھا۔ آپ ہر مسئلے کی گہرائی میں جاتے تھے اور استدلال کے بغیر کوئی بات قبول نہیں فرماتے تھے آپ کے زمانے میں لوگارثم کا استعمال تو ایک طرف رہا کسور اعشاریہ کا استعمال بھی شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ یہ حواشی انتہائی کاوش کا نتیجہ ہیں اور کیلکولیٹر کے بغیر حسابی عمل کافی محنت طلب ہے۔

---

[7] ثبوت اسطرح ہے۔

$$\sin\theta = \theta - \frac{\theta^3}{3!} + \frac{\theta^5}{5!} - \dots$$

$$\cos\theta = 1 - \frac{\theta}{2!} + \frac{\theta^4}{4!} \dots$$

$$\frac{\sin\theta}{\theta} = 1 - \frac{\theta^2}{6} + \dots = \left(1 - \frac{\theta^2}{2}\right)^{1/3} \simeq (\cos\theta)^{1/3}$$

$$\sin\theta = \theta\,(\cos\theta)^{1/3}$$

$$\sin x = x''\,\frac{\pi}{180\times 60\times 60}\,(\cos x'')^{1/3} = \frac{x''\,\sin 1''}{(\cos x'')^{1/3}}$$

اور لوگارثم لینے سے کتاب میں درج کلیہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حاشیہ صفحہ ۲۰ پر مماس قوس کا کلیہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

[8] اعلیحضرت کے طریقہ کا ثبوت اسطرح ہے:۔

$$\sin x'' \simeq \frac{\pi}{180\times 60}\cdot\frac{1}{60}\cdot x$$

$$\simeq \left(\frac{\sin 1'}{60}\right) x$$

$$\log\sin x'' = (\log\sin 1' - \log 60) + \log x \quad \text{اور}$$

$$= 4.6855749 + \log x$$

[9] degree

امام احمد رضا قدس سرہٗ کا

معراج نامہ

از: مرزا نظام الدین بیگ جامؔ

زیرِ نظر مقالہ محترمی جناب نظام الدین بیگ صاحب ایم اے شعبہ مخطوطات نیشنل میوزیم کراچی کی کاوشِ قلم ہے۔ موصوف نے جس انداز میں قصیدہ معراجیہ پر قلم اٹھایا وہ انہی کا حصّہ ہے۔ موصوف کا مفصّل مقالہ زیرِ طبع ہے۔ ادارہ معارفِ رضا شکریہ کے ساتھ مقالہ کی تلخیص شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے —— سید محمد ریاست علی قادری

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

بلا شبہ حیات ایک مدت تک کعبہ و بُت خانہ میں سرگرمِ فغاں رہی۔ تب کہیں بزمِ عشقِ محمدی میں امام احمد رضا جیسا دانائے راز نمودار ہوا۔ وہ بزمِ پیامِ محمدی کے آداب شناس دانائے راز بھی تھے۔ اور جامِ بادۂ احمدی کے خود آگاہ بادہ گسار بھی تھے۔ ان جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں صدیوں بعد منصہ شہود پر جلوہ آرا ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت جامع صفات تھی۔ وہ دنیائے اسلام کے ایک فقید المثال محقق تھے۔ علومِ دینی و دنیوی کا ہستم بالشان مینارۂ نور تھے۔ جس کی ہر شعاع ظلمتوں میں بھٹکتے ہوئے راہی کی راہوں کا تعین کرتی ہے۔ دینی اور دنیوی علوم کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جسے ان کی جولانئ طبع نے اپنی تگ و تاز کا مرکز نہ بنایا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایسے سالکِ راہِ طریقت بھی تھے جو ایقان کی منزل سے گزر کر اپنے پیچھے رشد و ہدایت کی تاباں کہکشاں چھوڑ جاتا ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ ۱۴ جون ۱۸۵۶ء میں جہادِ حریت سے ایک سال قبل شہر بریلی (اترپردیش بھارت) میں پیدا ہوئے ۱۳ سال کی عمر میں علومِ متداولہ کی تکمیل کر کے تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ اور ۵۴ سال تک مسلسل دینی اور علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں مختلف علوم پر ایک ہزار آپ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں آپ نے وفات پائی۔

ایک ایسی پہلو دار نورِ بداماں شخصیت جس کا ہر رُخ خیرہ کن ہے۔ مجھ جیسے بے مایہ اور بے بضاعت انسان کے لیے اس کے کسی ایک رخ پر ہی سہی خامہ فرسا ہونا بہت دشوار مرحلہ ہے۔ ان کی قد آور شخصیت کا تنوع کچھ ایسا ہمہ گیر ہے کہ بیک وقت سب کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ وصف شناس۔ اہلِ علم و دانش ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ اس وقت میرے اشہبِ فکر کو ان کی جس صفت نے مہمیز کیا وہ ان کی ذاتِ گرامی کا داخلی حسن اور قلبی لطافت ہے۔

جسکا عکس ان کی نعتیہ شاعری میں جلوہ فگن ہے۔

پیشِ نظر معراج نامہ قصیدے کے انداز میں ہے جس میں ۷۱ اشعار ہیں۔ اسکی تکنیک ماقبل کے سارے معراج ناموں سے بالکل مختلف ہے جنکا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں معراج کی روایات کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ شبِ معراج کا تہنیت نامہ ہے۔ جس میں بہجت آگین افکار کی نغمگی کا بہاؤ پورے قصیدے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

زبان

اس کی زبان نہایت سادہ، شائستہ اور بامحاورہ ہے۔ روزمرہ کا برمحل اور مناسب صرف قریب قریب ہر شعر میں نظر آتا ہے۔ زبان کی سلاست یہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے کہ آیت کریمہ یا احادیث کی تلمیحات تک سے امکانی طور پر کلام کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ معراج کے ذکر میں ایسا کرنا بہت دشوار ہے۔ ایسا نہیں کہ امام موصوف کی فکر نے ان مقامات کو چھوا نہیں جہاں "تلمیح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ بلکہ ان مقامات کو ایسے سلیس انداز میں بیان کرتے ہیں جہاں اسکی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور مطلب واضح ہو جاتا ہے مثلاً "قابَ قوسین" کی ترجمانی دیکھیئے:-

" محیط و مرکز میں فرق مشکل ہے نہ فاصل خطوطِ واصل
کمانِ حیرت میں سر جھکائے عجیب چکر میں دائرے تھے"

عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ جو صوتی اعتبار سے سماعت پہ گراں گزرتے ہیں بہت کم استعمال ہوئے ہیں۔ بیشتر خالص اردو کے مترنم الفاظ مصرعوں میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

" خبر یہ تحویلِ مہر کی تھی کہ رُت سہانی گھڑی پھرے گی
وہاں کی پوشاک زیبِ تن کی یہاں کا جوڑا بڑھا چکے تھے"
اٹھی جو گردِ رہِ منوّر وہ نور برسا کہ راستے بھر
گھرے تھے بادل بھرے تھے جل تھل امنڈ کے جنگل ابل رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا کی زبان کی یہ شستگی مرئی اور غیر مرئی دونوں تھی۔ مرئی اس لحاظ سے کہ فن شاعری کے ذوق نے انہیں اساتذہ فن کے افکار سے آشنا کیا ہوگا۔ ان کا زمانہ بہ اعتبار ترقیٔ زبان کلاسیکی عہد ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں داغؔ دہلوی کی فصیح البیانی اور سحر طرازی کا طوطی بول رہا تھا۔ کوئی وجہ نہیں کہ داغؔ کی شیریں بیانی امام موصوف کے گوشِ زمزمہ نیوش نہ ہوئی ہو جبکہ ان کے برادر خورد مولانا محمد حسن رضا داغؔ کے شاگرد تھے۔ لہٰذا زبان کی سادگی اور صفائی پر بطورِ خاص ان کی توجہ رہی ہوگی۔

زبان کی سادگی غیر مرئی اس لحاظ سے کہہ رہا ہوں کہ ان کے تہنیت نامۂ معراج میں مضامین کی آورد نہیں بلکہ آمد ہی آمد ہے۔ بیان میں تصنع کے بجائے خلوص کی کارفرمائی ہے۔ ان کی فکرِ شعری کے سوتے ذہن سے نہیں بلکہ قلب کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں۔

اپنے معراج نامہ میں امام احمد رضا نے عروسِ فن کے لب و رخسار کو خالص اردو الفاظ اور بندشوں کے سامانِ آرائش سے سجایا ہے اور اس کاوش میں ایک ماہرِ فن کی چابکدستی کا پورا پورا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

بہ الفاظ دیگر اس میں فن کے وہ تمام محاسن موجود ہیں جو ایک اچھے فن پارے میں ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

حسنِ کلام

بندشیں چست اور برمحل شیریں الفاظ کا دروبست، تشبیہات کی سادگی اور نکھار، استعارات کی جودت، لہجے میں گھلاوٹ اور وارفتگی، طرزِ ادا میں نفاست، جذبات میں خلوص اور بے ساختگی، فکر میں رعنائی اور رفعت، خیال کی شادابی اور طہارت۔ ان ہی عناصر کے امتزاج سے امام رضا کے تہنیت نامہ کے چہرہ کا غازہ تیار ہوا ہے۔

اندازِ بیاں کا نکھار ملاحظہ ہو۔

یہ جوششِ نور کا اثر تھا کہ آب گوہر کمر کمر تھا
صفائے رہ سے پھسل پھسل کر ستارے قدموں پہ لوٹتے تھے۔

وہ ظلِ رحمت وہ رخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زربفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

اتار کر ان کے رخ کا صدقہ یہ نور کا بٹ رہا تھا باڑا
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے

وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لیے تھے۔

یہ ان کی آمد کا دبدبہ تھا نکھار ہر شئے کا ہو رہا تھا
نجوم و افلاک جام و مینا اجالتے تھے کھنگالتے تھے

وہ باغ کچھ ایسا رنگ لایا کہ غنچہ و گل کا فرق اٹھایا
گرہ میں کلیوں کے باغ پھولے گلوں کے تکمے لگے ہوئے تھے

بچا جو تلووں کے ان کا دھوون بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنہوں نے دولہا کی پائی اترن وہ پھول گلزار نور کے تھے

منظر نگاری

اس تہنیت نامہ میں سرور و نشاط کی کیفیت نے ایک متحرک بہاریہ فضا پیدا کر دی ہے جس کی عکاسی امام احمد رضا نے نہایت وارفتہ اور پر کیف انداز میں کی ہے۔ ان کے لہجے کی گھلاوٹ کیف و مستی کے تصوراتی منظر کو ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتی ہے اور ہم اس کی سرمستیوں کے بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

وہ چھوٹ پڑتی تھی ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی پھیلی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے

نئی دلہن کی پھبن میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا
حجر کے صدقے کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

خوشی کے بادل امنڈ کے آئے دلوں کے طاؤس رنگ لائے
وہ نغمۂ نعت کا سماں تھا حرم کو خود وجد آ رہے تھے

یہ جھوما میزابِ زر کا جھومر کہ آ رہا کان پر ڈھلک کر
پھوہار برسی تو موتی جھڑ کر حطیم کی گود میں بھرے تھے

دلہن کی خوشبو سے مست کپڑے نسیم گستاخ آنچلوں سے
غلافِ مشکیں جو اڑ رہا تھا غزال نافے بسا رہے تھے

پہاڑیوں کا وہ حسنِ تزئین وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکیں
صبا سے سبزے میں لہریں آئیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

نہا کے نہروں نے وہ چمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے

پرانا پر داغ ملگجا تھا اٹھا دیا فرش چاندنی کا
ہجومِ تارِ نگہ سے کوسوں قدم قدم فرش باڈلے تھے۔

خدا ہی دے صبر جانِ پرغم دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم
جب ان کو جھرمٹ میں لے کے قدسی جناں کا دولہا بنا رہے تھے

ملاحظہ کیجیے منظر کشی کتنی فطری ہے۔ وارفتگی بیان میں رنگ بیان کہیں شوخ نہیں ہونے پاتا۔ پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک لطیف نشاطیہ رو ہے جو پورے منظر پر چھائی ہوئی ہے۔ پروازِ تخیل کا سنبھالا ہوا اور متوازن انداز ہے جو بیل بوٹے سجائے گئے ہیں ان میں مقامی بو باس ہے یعنی امام رضا کی [illegible] میں ملکی رنگ پوری طرح غالب ہے جو اردو شاعری کا اپنا مزاج ہے۔

موسیقی

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے شعر میں موسیقی کا دار و مدار بحر کے انتخاب پر منحصر ہے۔ امام رضا کے مزاج کی نغمگی ملاحظہ کیجیے۔ اپنے تہنیت نامہ کے لیے جس بحر کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بالذات مترنم بحر ہے۔ اس تہنیت نامہ میں کوئی شعر ایسا نہیں جس میں موسیقی کا زیر و بم موجود نہ ہو۔ اس کے سانچے میں جو ہلکے پھلکے خالص اردو الفاظ

جوڑے گئے ہیں کہ یکسر سیال نغمے میں ڈھل گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حجاب اٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

براق کے نقشِ سم کے صدقے وہ گل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن مہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

زبانیں سوکھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعفِ تشنگی تھا کہ حلقے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

شاعرانہ نکتہ سنجی — ان کے معراج نامہ میں شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے ایسے فنکارانہ نمونے نظر آتے ہیں کہ ذوقِ جمال جھوم اٹھتا ہے۔ ان کو کسی خیال کی توجیہہ شاعرانہ پیش کرنے کا بڑا پاکیزہ سلیقہ آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

ستم کیا کیسی مت کٹی تھی قمر وہ خاک ان کے رہگزر کی۔
اٹھا نہ لایا کہ ملتے ملتے یہ داغ دیکھنا سب مٹے تھے

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال و جلال کی کیفیت کا پرتو اور اس کے اثرات ملاحظہ ہوں :۔

نقاب الٹے وہ مہرِ انور جلالِ رخسار گرمیوں پہ
فلک کو ہیبت سے تپ چڑھی تھی تپکتے انجم کے آبلے تھے

اب ذرا اسی خیال کا عروج بھی دیکھیے :۔

وہ ظلِ رحمت وہ رخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زربفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے۔

یہ طاقت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

سدرۃ المنتہیٰ — واقعاتِ معراج میں مقامِ سدرۃ المنتہیٰ ایک نازک مقام ہے شعراء نے طرح طرح سے اس کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن امامِ رضا کا فکری پیمانہ اس مقام کی ترجمانی میں سب سے الگ چھلکتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

چلا وہ سروِ چماں خراماں نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے سب این و آں سے گزر چکے تھے

جھلک سی اک قدسیوں پہ آئی ہوا بھی دامن کی پھر نہ پائی
سواری دولہا کی دور پہنچی برات میں ہوش ہی اڑے تھے

تھکے تھے روح الامیں کے بازو چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی امید ٹوٹی نگاہِ حسرت کے ولولے تھے

روش کی گرمی کو جس نے سوچا دماغ سے اک بھبوکا پھوٹا
خرد کے جنگل میں پھول چمکا دہر دہر پیڑ جل رہے تھے

جلو میں جو مرغِ عقل اڑے تھے عجب برے حالوں گرتے پڑتے
وہ سدرہ ہی پر رہے تھے تھک کر چڑھا تھا دم تیور آ گئے تھے

قوی تھے مرغانِ وہم کے پر اڑے تو اڑنے کو اور دم بھر
اٹھائی سینے کی ایسی ٹھوکر کہ خونِ اندیشہ تھوکتے تھے

مقامِ اعلیٰ کی ترجمانی میں ان کی فکر کی چابک دستی کا کمال یہ ہے کہ وارفتگی اور سرشاری میں بھی کوئی فرق نہیں آیا اور احتیاط کا دامن بھی فکر کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہیں پایا۔ پوری کیفیت کے ساتھ اس نازک مقام سے گزر گئے۔ اندازِ بیاں کا شاعرانہ حسن اور لہجے کی شگفتگی بھی پوری طرح برقرار رہی۔ باوجود سرشاری اور طرب انگیزی کے۔ ان کا شاعرانہ شعور بے خود نہیں ہونے پایا۔ نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدود کا احساس چونکا رہتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

طرب کی نازش کہ ہاں لچکیے ادب وہ بندش کہ ہل نہ سکیے
یہ جوشِ ضدین تھا کہ پودے کشاکشِ ارہ کے تلے تھے

ساکنانِ سماوی کا ردِ عمل — حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قدومِ میمنت لزوم کا عرشیوں پر ردِ عمل جس شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے ساتھ بیان ہوا ہے ملاحظہ فرمائیے :۔

سنا یہ اتنے میں عرشِ حق نے کہ لے مبارک ہوں تاج والے
وہی قدم خیر سے پھر آئے جو پہلے تاجِ شرف ترے تھے

یہ سن کے بے خود پکار اٹھا نثار جاؤں کہاں ہیں آقا
پھر ان کے تلووں کا پاؤں بوسہ یہ میری آنکھوں کے دن پھرے تھے

جھکا تھا مجرے کو عرشِ اعلیٰ گرے تھے سجدے میں بزمِ بالا
یہ آنکھیں قدموں سے مل رہا تھا وہ گرد قربان ہو رہے تھے

ضیائیں کچھ عرش پر جو آئیں تو ساری قندیلیں جھلملائیں
حضورِ خورشید کیا چمکتے چراغ منہ اپنا دیکھتے تھے

یہ ان کی آمد کا دبدبہ تھا نکھار ہر شئے کا ہو رہا تھا
نجوم و افلاک جام و مینا اجالتے تھے کھنگالتے تھے

نہ حکیمانہ موشگافیاں ہیں نہ صوفیانہ دقیقہ سنجیاں بلکہ لہجے میں خالص شاعرانہ رچاؤ ہے۔

محب و محبوب کی قربتوں اور فاصلوں کی گنگا جمنی بھی دیکھتے چلیے :۔

تبارک اللہ شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لن ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

سراغ این و متیٰ کہاں تھا نشان کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

ادھر سے پیہم تقاضے آنا اُدھر تھا مشکل قدم بڑھانا
جلال و ہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت ابھارتے تھے

بڑھے تو لیکن جھجکتے ڈرتے حیا سے جھکتے ادب سے رکتے
جو قرب انہیں کی روش پہ رکھتے تو لاکھوں منزل کے فاصلے تھے

ہوا نہ آخر کہ ایک بجرا تموّجِ بحرِ ہو میں ابھرا
دنیٰ کی گودی میں ان کو لے کر فنا کے لنگر اٹھا رہے تھے

کسے ملے گھاٹ کا کنارا کدھر سے گزرا کہاں اتارا
بھرا جو مثلِ نظر طرارہ وہ اپنی آنکھوں سے خود چھپے تھے

معراج کے ان نازک مقامات کی عکاسی کتنے پر کشش انداز میں ہوئی ہے۔ خیال بھی بلند ہے اور اظہارِ خیال بھی ارفع۔ مطالب الفاظ اور بندشوں کے سلاسل میں کہیں مقید نہیں یعنی تعقیدِ خیال کہیں محسوس نہیں ہوتی بلکہ تخیلات کی ایک بسیط کہکشاں ہے جو فکر کے افق پر پھیلی ہوئی نظر آرہی ہے۔

لامکانی کی کیفیت کی ترجمانی

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھے تو عقلِ انسانی نے سپر ڈال دی کہ یہ لامکان کی کیفیت تھی۔ واقعۂ معراج میں اس اہم کیفیت کی ترجمانی دنیا کے عظیم شعراء نے کی ہے۔ یہاں میں دو بہت بڑے فارسی شعراء کے معراج نامے سے ان کے وہ اشعار پیش کر رہا ہوں۔

جب سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تمام جہات سے آزاد ہو کر وحدتِ کل میں جذب ہو گئی۔ اس حال کی ترجمانی نظامی گنجوی اسطرح کرتے ہیں :۔

بانہ از جہت بہم شکستی
در زحمتِ فوق و تحت رستی

مقامِ قاب قوسین کی ترجمانی ملاحظہ ہو :۔

قاب قوسین اندراں اثناء
از دنی بیشتر بقاب او ادنیٰ

ان ہی مقامات کو جناب امیر خسروؒ نے اس طرح بیان کیا ہے :۔

گریباں جہت را پارہ کردہ
جہاں بے جہت نظارہ کردہ
جلوہ کرد از ورائے کونینش
سر بدرگاہِ قاب قوسینش

اب اسی خیال کو امام احمد رضا کے یہاں بھی دیکھیے کتنی تمکنت اور کیسے وقار کیساتھ بیان ہوا ہے :۔

خبر دیسے کہہ دو کہ سر جھکا لے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

پران کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقتاً فعل تھا ادھر کا
تنزلوں میں ترقی افزا دنیٰ تدلیٰ کے سلسلے تھے

وحدتِ کل میں گم ہونے کی کیفیت جس شاعرانہ لطافت سے امام احمد رضا علیہ الرحمتہ نے پیش کی ہے نظامی جیسا دردکش بادۂ عرفاں اور بیلیِ سخن کا اداشناس بھی نہ پیش کر سکا۔ ہاں امیر خسروؒ نے لامکانی کی کیفیت اچھے انداز میں پیش کی ہے لیکن امام رضا کی فکر نے جو نادر پیرایہ اختیار کیا ہے اسکی ہمہ گیری ان دونوں اساتذہ سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے دوسرے شعر میں مسئلہ وحدت جس بلاغت سے پیش ہوا ہے وہ امام رضا ہی کی فکرِ رسا کے بس کی بات تھی۔ "تنزلات" وحدت الوجود کی اصطلاح ہے۔ جب ذاتِ احدیت عالمِ کثرت میں نزول کرتی ہے اس عالم کو تنزلات کہتے ہیں۔ نقطۂ وحدت بواسطۂ تجلیات دائرہ موجوداتِ ممکنہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ محمود شبستری نے اپنے مثنوی "گلشنِ راز" میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:۔

یکی خط است ز اوّل تا بہ آخر
برو خلقِ جہاں گشتہ مسافر

اب ذرا یہ شعر دیکھئے:۔

پران کا بڑھنا تو نام کو تھا حقیقتاً فعل تھا ادھر کا
تنزلوں میں ترقی افزا دنیٰ تدلیٰ کے سلسلے تھے

مصرعِ ثانی میں تصوف کی اصطلاح "تنزلات" کے ساتھ آیاتِ کریمہ کے لفظ "دنیٰ" نے مل کر کتنے بلیغ معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ "تدلیٰ" کا ٹکڑا اضافی ہے۔ جو زورِ کلام کے لیے لایا گیا ہے۔ یہی نہیں بیان کی قدرت دیکھئے انداز بدل کر اسی خیال کو یوں بھی پیش کرتے ہیں:

کمانِ امکاں کے جھوٹے نقطو تم اول آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو کدھر سے آئے کدھر گئے تھے

وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اسی کے جلوے اسی سے ملنے اسی سے اسکی طرف گئے تھے

ان نازک مقامات کو اسی کی فکر چھو سکتی ہے جو بحرِ علم [illegible] شناور بھی ہو، ہادیِ عرفاں کا مالک بھی اور ساتھ ہی عروسِ سخن کا اداشناس بھی۔

بلاشبہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا معراج نامہ اردو نعتیہ شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس معراج نامہ میں مروّ[جہ] روش سے ہٹ کر ایک نئے انداز کا گہرا رنگ ہے۔ جسمیں معراج کی روائتی تفصیل کے بجائے ایک تاثراتی فضا پورے قصیدے پر پھیلی ہوئی ہے جسمیں ساز و آہنگ کا ارتعاش روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ یہ معراج نامہ موضوعاتی ہوتے ہوئے ان کے اندازِ بیاں کی وجہ سے تاثرا[تی] فضاء میں ڈھل گیا ہے اور یہی اسکی بنیادی صفت ہے۔ جو اسکو دوسرے معراج ناموں سے ممتاز کرتی ہے۔ خوش ذوقی فنی مہارت۔ بالغ نظ[ری] جمالیاتی احساس زفادر الکلامی۔ ندرتِ فکر و خیال اور جذباتی صداقت یہی وہ عناصر ہیں جنکی ترکیب سے اسکی تشکیل ہوئی ہے۔ اسکا نمایاں [جوہر] خلوص ہے۔ امام رضا نے اپنے خیالات کو ہمارے سامنے عقل و ذہن کی سطح سے اتار کر احساس اور جذبے کی گہرائیوں میں ڈبو کر پیش کیا ہے۔ اسی لیے انکا خیا[ل] ہمارے دلوں میں اتر جاتا ہے۔ ان کا اندازِ بیاں نہ خطیبانہ ہے نہ صوفیانہ بلکہ شاع[رانہ] ہے۔ انکی فکر نے معراج نامہ کی زبان اور بیان کو ایک نیا اور دلکش پیکر دیا ہے وہ تخیل سے واقعات کی تفصیلات کا کام نہیں لیتے بلکہ تاثر کے بہاؤ کو جذبے [کی] صداقت اور خلوص کی گہرائی کے ذریعہ مربوط طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہی تاثراتی ارتباطِ خیال اور اسکی خوبصورت پیشکش جو ان کے سلیس مترنم کلام کے ذریعہ ابھرتی ہے اس معراج نامہ میں انکا فنی اسلوب بن گئی ہے اپنے اسی انفراد[ی] انداز کی وجہ سے وہ محسن کاکوروی پر بھی فائق ہیں محسن کے معراج نامہ میں اندازِ بیا[ن] نکھار فارسی کی کلاسیکی بندشوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اسکے برعکس معراج نامۂ رضا میں انکے ہلکے پھلکے مترنم خالص اردو الفاظ نے جو سحر آفریں کیفیت پیدا کی ہے اسکی لذت

بہت گہری ہے اور یہی انکے نطق کا اعجاز ہے جو خلوصِ الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔

خطۂ خراساں کی خوش بختی

مولانا ظاہر شاہ صوات جیسے دور افتادہ علاقے میں رہ کر دین کی خدمت میں مصروف ہیں مولانا نے فاضل بریلوی کی حیات پر ایک رسالہ بھی تحریر کیا ہے۔ زیرِ نظر مضمون کی تمہید منفرد ہے۔ ادارہ مولانا کے جذبۂ تعاون پر مشکور ہے۔ — سید ریاست علی قادری

ملتِ مسلمہ کی منفرد اور بے مثال ہستیاں پیدا کرنے کا فخر خطۂ خراساں کو حاصل رہا ہے ان میں سے چند حضرات کے نام اور مختصر تعارف کیساتھ اسطرح پیش کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) محمد بن اسماعیل بخاری: جنہیں مشہور مجموعۂ حدیث پیش کرنیکا شرف حاصل ہوا جو آج بھی اصح الکتب بعد کتاب اللہ الباری صحیح البخاری سے پہچانی جاسکتی ہے۔

(۲) مسلم بن حجاج: صحیح بخاری کے بعد خدیثِ نبوی کی دوسری مشہور و مستند کتاب کے مرتب۔

(۳) ابو داؤد سجستانی: ابو داؤد کے نام سے مجموعہ احادیث مرتب فرمایا۔

(۴): امام نسائی: ان کا مرتب کردہ مجموعہ بھی صحاح ستہ میں شامل ہے۔

(۵) امام ترمذی: ان کے مرتب کردہ مجموعۂ حدیث کو بھی صحاح حدیث میں اہم مقام حاصل ہے۔

(۶) محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی: صحاح ستہ میں چھٹا مجموعۂ حدیث ان کا ترتیب دیا ہوا ہے۔

فن حدیث کی ان مذکورہ بالا چھ کتابوں کو صحاح ستہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ان مجموعۂ احادیث کے مرتبین کا تعلق صوبۂ خراساں سے ہے، تفصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے عرض یہ کرنا ہے کہ فی الوقت صحاح ستہ کا تعارف مقصود نہیں بلکہ ان حضرات محدثین کا تعلق خراساں سے ظاہر کرنا ہے۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سے محدثین کا تعلق خراساں سے رہا ہے۔ ان میں دارمی کے مرتب عبداللہ بن عبدالرحمان دارمی بھی، جنکا تعلق سمرقند سے تھا جو اسوقت صوبۂ خراساں میں شامل تھا۔

احمد بن الحسین بیہقی: یہ بزرگ محدث جس کا مجموعۂ حدیث بیہقی کے نام سے موسوم ہے وہ بھی خراساں ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خراساں کے خطہ نے صرف محدث ہی پیدا نہیں کیے بلکہ جلیل القدر فقہاء میں امام برہان الدین مرغینانی کی حیثیت محتاج تعارف نہیں بلکہ ان کی تالیفِ ہدایہ جو چار جلدوں پر محیط ہے اور فقہ میں اسکو مقام حاصل ہے اس کے مؤلف کا تعلق بھی صوبۂ خراساں ہی سے تھا۔

اس تمہید کے بعد میں اگر یہ عرض کروں کہ برِ صغیر کی ۱۸۵۶ء ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہونیوالی شخصیت جسکو دنیا مختلف القاب سے یاد کرتی ہے وہ شخصیت بھی صوبۂ خراساں ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ اور عرصہ دراز بعد اس کی وجہ سے خراساں کو پھر شہرت نصیب ہوئی تھی۔

یہ شخصیت جسکو دنیائے علم فقیہ العصر، عالم بے بدل عاشق رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سے یاد کرتی ہے، ان کے آباؤ اجداد بھی ترکِ وطن کرکے پہلے لاہور آئے اس کے بعد دہلی منتقل ہوئے اس کے بعد کی آنیوالی نسلوں نے بریلی کو مستقر بنایا۔ اس شخصیت کو دنیا نے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے نام سے پہچانا۔

عالم والد کے فرزند اور فاضل دادا کے پوتے فاضل بریلوی کی ولادت سے قبل والد محترم مولانا نقی علی خان صاحب نے ایک خواب دیکھا تو صبح کو اپنے والد محترم مولانا رضا علی خان صاحب کو سنایا۔ والد محترم نے فرمایا "تمہاری پشت سے اللہ کریم فرزند متولد فرمائے گا جو علم کے دریا بہائے گا اور تشنگان علم اس سے سیراب ہوں گے۔"

ہفتہ ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ کو ظہر کے وقت مولانا نقی علی خانصاحب کو قدرت نے فرزند عطا کیا۔ جب اس فرزند کو دادا جان کی گود میں دیا گیا تو فرزند کی پیشانی پہ آثار علم وفضل دیکھ کر مولانا رضا علی خان صاحب نے فرمایا "میرا یہ فرزند بھی علامہ الدہر ہوگا۔ پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ مسنون کی شب مولانا نقی علیخان نے پھر ایک خواب دیکھا تو اسکو والد صاحب کو سنایا جسکی موصوف نے یہ تعبیر دی کہ علم وفضل ہی میں نہیں بلکہ یہ فرزند منصب رشد وہدایت کو سنبھال کر روحانیت کی دنیا میں اپنی دھاک بٹھائے گا۔ اور اس کی شہرت پورے عالم میں ہوگی۔

والد محترم اور جد محترم نے اپنے اس فرزند میں وہ صلاحیتیں دیکھیں تو انہیں اپنے خوابوں اور ان کی تعبیروں کی جھلک نظر آئی۔ اور کیسے نظر آتی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارہ بلندی

ان حضرات نے اس فرزند کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی اور والد محترم نے تعلیم کی ذمہ داری خود سنبھالی اور چودہ سال کی عمر میں علم وفضل کا پیکر بنا دیا اور منصب افتاء پر بٹھا دیا۔

فاضل بریلوی نے جو علوم متداولہ والد محترم سے پڑھے اسکے علاوہ بہت سے علوم ذاتی مطالعہ سے حاصل کیے۔ ان علوم کے اگر نام ہی لکھے جائیں تو مضمون اسکا متحمل نہ ہو سکے گا۔

فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے جب ان علوم کے حصول کے بارے میں اظہار فرمایا تو یہ فرمایا کہ یہ بات فخر ومباہات کے طور پر نہیں بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم ہے کہ انہوں نے اپنے ان علوم سے حصہ مرحمت فرمایا جو بارگاہ احدیت سے انہیں حاصل ہوئے تھے۔ علوم متداولہ تو والد محترم سے پڑھے بہت سے علوم مطالعہ سے حاصل ہوئے اور بہت سے علوم بارگاہ رسالت سے سیکھے۔ روحانیت کی تعلیم کیلئے سرکار مارہرہ کی خدمت میں حاضری ہوئی اور یہ حصہ وہاں سے حاصل کیا۔ بیں اجازت رشد وہدایت حاصل ہوئی۔ اعمال واذکار کی اجازت ملی۔

سنہ ۱۲۹۴ھ میں والد محترم کی معیت میں حرمین شریفین کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس سفر کے دوران کاغذی کرنسی نوٹ کی بیع کے سلسلہ پر ایک مستقل کتاب کفل الفقیہ الفاهم فی حکم قرطاس الدراهم ریاضی کے علم میں مہارت تامہ حاصل کی اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی ملاقات کا واقعہ شہرت حاصل کر گیا ہے جسکی نقل کرنے کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ فاضل بریلوی نے علمی اور روحانی دنیا میں جو مقام حاصل کیا وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ روحانی دنیا میں انکو منفرد مقام حاصل تھا۔ ہندوستان کے اکابر فضلاء و علماء نے باوجود اسکے کہ وہ دوسرے میں مجاز وماذون تھے لیکن حصول فیض کیلئے آپ سے خلافت حاصل کی۔ روحانی فرزندوں کی کثیر تعداد کے ساتھ نسلی طور پر دو فرزند چھوڑے یہ دونوں اپنے وقت کے علماء اور فہماء میں بڑے فرزند حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خانصاحب تقسیم سے قبل راہی ملک بقا ہوئے لیکن دوسرے صاحبزادے مولانا مصطفیٰ رضا خانصاحب آج بھی خدمت دین پر مصروف ہیں اور ان کی ذات مجمع الصفات ہے اور ان کے بارے میں یہ بات یقین کیساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خانصاحب کی ذات مسلمانوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔

از: وجاہت رسول قادری

منقبت بخدمت اعلیحضرت قدس سرہ

تاجدارِ اہلسنت حضرتِ احمد رضا
ہیں امامِ اہلسنت حضرتِ احمد رضا

آپ ہی ہیں مرکزیت حضرتِ احمد رضا
آپ سے ہیں اہلسنت حضرتِ احمد رضا

صدرِ بزمِ علم و حکمت، عاملِ دینِ محمدی
راہبر ہیں اعلیحضرت حضرتِ احمد رضا

ہے نوا سنجانِ طیبہ میں بہت اعلیٰ مقام
بلبلِ باغِ مدینہ حضرتِ احمد رضا

اسوۂ حسنہ کا ہے اِک خوبصورت آئینہ
پیکرِ عشق و محبّت حضرتِ احمد رضا

ہر عمل خود مَن یُّطِع اللّٰہ کی تفسیر ہے
متبع دین و سنت حضرتِ احمد رضا

کوئی بزمِ علم ہو یا ہو کوئی بزمِ سخن
آپ ہی ہیں اعلیحضرت حضرتِ احمد رضا

علم کے مینار ہیں اب چار وانگِ دہر میں
آپ کے احباب و عترت حضرتِ احمد رضا

ہے فنا فی الذاتِ اقدس عشق کا اعلیٰ مقام
لے گئے ہیں اسمیں سبقت حضرتِ احمد رضا

اہلِ ایماں کے لیے اب تو کسوٹی ہے یہی
آپ سے ہے کس کو الفت حضرتِ احمد رضا

ہم گرفتارِ بلا ہیں آج پھر اس دور میں
آپ کی ہے پھر ضرورت حضرتِ احمد رضا

کفر اور الحاد کا طوفان بادر یار ہے
المدد یا اعلیٰ حضرت حضرتِ احمد رضا

آج سینوں میں ہے تاباں نورِ عشقِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)
آپ کا ہے فیض و برکت حضرتِ احمد رضا

فاضل بریلوی کے معاشی نکات

جدید معاشیات کے آئینے میں

از: پروفیسر محمد رفیع اللہ صدیقی۔
ایم۔ اے، ایم۔ ایس (کوئینز یونیورسٹی کینیڈا)

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ اپنی تحقیق کے دوران ڈاکٹر صاحب کی دور رس نگاہیں مولانا احمد رضا خاں کے ان نکات کی طرف مرتکز ہو گئیں جو انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی و معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے اپنے رسالے "تدبیر فلاح و نجات و اصلاح" میں تحریر فرمائے اور جو ۱۹۱۲ء / ۱۳۳۱ھ کلکتہ سے شائع ہوئے۔ ان نکات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے، مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں پس انداز ہو سکیں۔

۲۔ بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدرآباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بینک کھولیں۔

۳۔ مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔

۴۔ علم دین کی ترویج و اشاعت کریں۔

یہ چار نکات بظاہر بے حد مختصر ہیں لیکن ان میں معانی کا جو ذخیرہ پوشیدہ ہے اس کے اظہار کے لیے ڈاکٹر صاحب نے مجھے منتخب فرمایا ہے کہ میں بحیثیت معاشیات کے طالب علم ان نکات کی وضاحت کروں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اگرچہ گذشتہ بیس سال سے معاشیات پر درس دے رہا ہوں لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنے احساسات کو قلمبند کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ پھر بھی میں نے ارادہ کیا ہے کہ ان نکات کی وضاحت کرنے کی پوری پوری کوشش کروں۔

علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

بلاشبہ مومن کے اشارے ہیں اور مومن بھی کیسا مومن کہ جس کی ہر سانس عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معطر تھی۔ ان اشاروں میں جہان معنی پوشیدہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ان نکات پر بحث کروں، بطور تمہید کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ یہ نکات شائع ہوئے برصغیر میں علم اقتصادیات کا مطالعہ عام نہیں تھا۔ دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک مثلاً انگلینڈ، امریکہ، فرانس اور جرمنی وغیرہ میں دانشوروں کا ایک مخصوص حلقہ اس علم کے اکتساب کی طرف مائل تھا۔ معاشیات پر بافائدہ کتابیں

لکھی جا چکی تھیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن عوام کی توجہ اور دلچسپی اس مضمون کے متعلق بہت کم تھی۔ طلباء اس مضمون کو خشک سمجھ کر اس سے گریز کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اور خاص طور پر ۳۰-۱۹۲۹ء کی عظیم عالمی سرد بازاری کے بعد معاشیات کی اہمیت میں جس تیزی سے اضافہ ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ امریکہ میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں معاشیات کے طلباء کی تعداد بہت کم تھی۔ خواتین خصوصاً یہ مضمون پڑھنے سے کتراتی تھیں۔ لیکن ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد حالات یک لخت بدل گئے اور معاشیات کے طلباء کی تعداد میں بے اندازہ اضافہ ہوا، اور اب تو امریکی ماہرین تعلیم اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ پرائمری سطح ہی سے طلباء کو معاشیات کی تعلیم دی جائے۔

بہرحال یہ امر واقع ہے کہ علم اقتصادیات میں عوام اور حکومتوں کی دلچسپی کا آغاز ۳۰-۱۹۲۹ء کی عالمی سرد بازاری کی وجہ سے ہوا۔ کساد بازاری کو قابو میں لانے کے لیے کلاسیکی نظریات موجود تھے لیکن اس عظیم عالمی کساد بازاری نے ان نظریات کو باطل کر دیا اور اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ ایک ایسے نئے نظریہ کی ضرورت ہے جو اس کساد بازاری پر قابو پانے میں مدد دے سکے۔ بالآخر ۱۹۳۶ء میں ایک انگریز ماہر اقتصادیات جے ایم کینز (J. M Keynes) نے اپنا مشہور زمانہ "نظریہ روزگار و آمدنی" پیش کیا جو اقتصادیات کے میدان میں ایک انقلاب کا سبب بنا۔ اس انقلابی نظریہ نے حکومتوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اس عالمی سرد بازاری پر مکمل قابو پا لیں۔ کینز کو ان کی خدمات کے صلہ میں تاج برطانیہ نے لارڈ کے خطاب سے نوازا جو کسی بھی انگریز کے لیے اعلیٰ ترین خطاب ہے اور باعث افتخار۔

اس تمہید سے میری غرض صرف اتنی ہی ہے کہ ناظرین یہ ذہن نشین کریں کہ جدید اقتصادی نظریات کی ابتداء ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہوئی اور یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ نگاہ مرد مومن نے ان جدید اقتصادی تقاضوں کی جھلک ۱۹۱۲ء ہی میں دکھا دی تھی۔ اگر ۱۹۱۲ء سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نکات پر غور و فکر کیا جاتا اور صاحب حیثیت مسلمانان ہند اس پر عمل کرتے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت معاشی اعتبار سے انتہائی مستحکم ہوتی۔

آئیے اب ان نکات پر الگ الگ بحث کی جائے جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا بریلوی کے ان نکات کی تعداد چار ہے جس میں تین کا تعلق میرے نزدیک جدید اقتصادیات کی روح سے ہے اور چوتھا علم دین کی ترویج و اشاعت سے متعلق ہے۔

۱- پہلا نکتہ یہ ہے؛

> "ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہو رہے پس انداز ہو سکیں۔"

اس نکتے میں اہم بات "پس اندازی" ہے۔ فضول خرچی کی مذمت ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو [illegible] قبل ہی کر دی تھی۔ جدید ماہرین اقتصادیات فضول خرچی کی بے حد مذمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر پیداواری کاموں پر کئے جانے والے اخراجات قطعاً غیر پیداواری حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر برصغیر کے مسلمانوں کی بیسویں صدی عیسوی میں پاکستان بننے سے پہلے تک کی اقتصادی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے باہمی مقدمہ بازیوں پر کروڑوں روپے ضائع کئے۔ یو۔ پی۔ میں تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں ۱۴ فی صد تھی لیکن اقلیت ہونے کے باوجود وہ ایک باعزت اور پر وقار زندگی گزار رہے تھے۔ مسلمانوں کی اقتصادیات اور ان کی خوشحالی کا انحصار زمینداری پر تھا۔ یو۔ پی میں مسلم نوابین، راجاؤں اور زمینداروں کی کمی نہ تھی۔ زمیندار اس صوبے میں وہ افراد ہوتے تھے جو کم از کم ایک گاؤں کے مالک ہوتے تھے۔ لیکن میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ حضرات مقدمہ بازیوں میں پھنسے رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مقدمہ بازی ان صاحبان کا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ میرے ایک قریبی عزیز

جو زمیندار تھے بارہ برس سے مسلسل ہمارے گھر آتے رہتے تھے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہم زلف سے مقدمہ بازی کے سلسلے میں آتے جاتے رہتے ہیں ۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل نے یو۔ پی کے مسلمانوں کی معیشت پر زمینداری کا خاتمہ کر کے بھرپور وار کیا اور مسلمانوں کی اقتصادیات کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

فاضل بریلوی کے پہلے نکتے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ مقدمہ بازی پر کئے جانے والے اخراجات کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے پہلی بات تو یہ کہ اس طرح مسلمان آپس میں مخالفت پر تلے رہتے تھے دوسری اور اہم بات یہ تھی کہ یہ کروڑوں روپیہ جو مقدمہ بازی کی نذر ہو رہا تھا کاش کہ اگر بچا یا جا سکتا تو مسلمانوں کے کس قدر کام آتا ۔ یہ اخراجات قطعاً غیر ضروری تھے ۔ اگر مفاہمت اور سمجھ بوجھ سے کام لیا جاتا تو اکثر و بیشتر مقدمات کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی اور معاملات باہمی صلاح و مشورے سے طے ہو جاتے اور مسلمانوں کا سرمایہ غیروں کی تقویت کا باعث نہ بنتا۔

فاضل بریلوی نے ۱۹۱۲ء میں پس اندازی کی ہدایت فرمائی تھی کیونکہ انہیں احساس تھا کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے کا بہترین علاج ہے کہ وہ غیر ضروری اخراجات یکسر ختم کر دیں اور اس طرح جو کچھ پس انداز ہو وہ اپنی فلاح و بہبود پر صرف کریں ۔ ۱۹۳۶ء میں کینز نے اپنا نظریہ" روزگار و آمدنی" پیش کر کے جدید اقتصادیات کی بنیاد مضبوط کی ۔ اس کے نظریہ کی اہم ترین "مساوات" میں بچت اور سرمایہ کاری سب سے اہم متغیرات (variables) ہیں ۔ اس کے نزدیک معیشت میں اقتصادی توازن کے لیے یہ شرط ہے کہ

SAVING = INVENSTMENT بچت = سرمایہ کاری

جب تک یہ شرط پوری ہوتی رہے گی سرمایہ دارانہ معیشت میں توازن برقرار رہے گا ۔ لیکن جہاں ان دونوں میں عدم مساوات پیدا ہوئی معیشت کا توازن بگڑ جائے گا ——— یا تو معاشرہ کساد بازاری کا شکار ہو جائے گا یا افراط زر کا ۔ دونوں ہی صورتیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی نقطہ نظر سے خطرناک ہیں ۔ لہذا کوشش اس بات کی ضروری ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری میں توازن برقرار رہے ۔ فرد یا افراد کے لیے یہ توازن لانا بے حد مشکل ہے ۔ لہذا کینز نے حکومتوں کو مشورہ دیا کہ وہ معاشی افعال میں بھرپور حصہ لیں ۔ اب تک ماہرین معاشیات حکومتوں کو چند ضروری شعبوں (مثلاً دفاع ، پولیس، صحت ، تعلیم اور رسل و رسائل وغیرہ) میں حصہ لینے کے علاوہ باقی شعبوں سے دور رہنے کی تجاویز دیتے تھے تاکہ معاشرہ میں فرد کی اقتصادی آزادی متاثر نہ ہو ۔ حکومتیں اس پر عمل بھی کرتی تھیں ۔ لیکن ۳۰-۱۹۲۹ء کی عالمی کساد بازاری نے قدیم ماہرین معاشیات کے اس نظریے کو غلط ثابت کر دیا ۔ ادھر کینز کے مشورہ پر عمل کیا گیا ۔ حکومتوں نے معیشت کے ہر شعبے میں بھرپور حصہ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو کساد بازاری سے نجات مل گئی اور ——— کینز کو انگلینڈ کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا ۔

موجودہ دور، اقتصادی منصوبہ بندی کا دور ہے ۔ دنیا کے بیشتر ممالک ملک کی خوشحالی میں اضافہ کے باقاعدہ منصوبے بناتے ہیں ۔ ان منصوبوں کی میعاد عموماً ۵ سال ہوتی ہے ۔ انقلاب روس کے بعد کمیونسٹ ماہرین اقتصادیات نے روس کی معاشی ترقی کے لیے پنج سالہ ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا ۔ آج پسماندہ ممالک بھی اقتصادی ترقی کی دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں ۔ روس کے بعد بیشتر ترقی پذیر ممالک میں پنجسالہ ترقیاتی منصوبوں کو مقبولیت بخشی ہے اور ان ممالک میں اقتصادیات کے ماہرین ملکی وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندیوں میں مشغول ہیں ۔ جہاں اقتصادی منصوبہ بندی میں دیگر اور باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں ماہرین اس بات کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں کہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے کن ذرائع سے رقم حاصل کی جا سکتی ہے ۔ منصوبوں کے لیے رقم دو ذرائع سے حاصل ہوتی ہے :

(۱) ملکی بچت اور (۲) قرضے

ملک میں اگر بچت کی شرح اونچی ہے تو ملکی ذرائع ہی سے منصوبوں پر عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن بچت کی شرح کم ہونے کی صورت میں حکومت کو غیر ملکی قرضوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ منصوبہ بندی کی تکمیل کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ حسب ضرورت ملک کا مرکزی بینک نوٹ چھاپ چھاپ کر حکومت کے حوالے کرتا رہے لیکن یہ طریقہ ارزاں ہوتے کے ساتھ ساتھ بے حد خطرناک بھی ہے اس سے ملک میں افراط زر آ جاتا ہے اور اگر افراط زر پر حکومت جلد قابو نہ پا سکے تو پھر اس کے نتائج انتہائی سنگین ہوتے ہیں اور معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔

لہذا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ملک میں بچتوں کی ہمت افزائی کی جائے اور لوگوں کو بچت کرنے پر مجبور کیا جائے۔ پسماندہ ممالک میں بچت کی شرح بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں بچت کی اہمیت بہت کم ہے کیونکہ ان کی آمدنیاں بے حد قلیل ہیں۔ اگر افراد کی آمدنیوں میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا بھی ہے تو افراد اسے اشیائے صرف پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ بیشتر ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری کی شرح ۵ فی صد سے ۸ فی صد ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح ۱۵ فی صد سے ۱۸ فی صد ہے یعنی ترقی پذیر ممالک اپنی قومی آمدنی کا صرف ۵ سے ۸ فی صد حصہ سرمایہ کاری کے لیے خرچ کرتے ہیں جب کہ اقتصادی ترقی کا تقاضا ہے کہ قومی آمدنی کا کم از کم ۱۵ فی صد سرمایہ کاری کے لیے وقف کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ کینز کی مشہور زمانہ مساوات (Equation) کے مطابق

بچت = سرمایہ کاری

اگر بچتیں زیادہ ہیں تو سرمایہ کاری زیادہ ہوگی لیکن بچتیں اگر کم ہیں تو اقتصادی ترقی کی رفتار بیحد سست ہوگی۔ ۱۹۵۰ء میں ایک امریکی ماہر اقتصادیات کولن کلارک (Collin Clark) نے بھارت، چین اور پاکستان کے لیے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ان ممالک کی اقتصادی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں کے افراد کم از کم قومی آمدنی کا ۱۲ فی صد پس انداز کریں اور اسے سرمایہ کاری میں لگائیں۔ لہذا آج کل ہر ملک میں خواہ وہ پسماندہ ہو یا ترقی یافتہ، بچت میں اضافے کے لیے مختلف اسکیموں پر عمل کیا جاتا ہے۔ خود پاکستان میں ہماری حکومت نے ایسی بہت سی اسکیمیں رائج کر رکھی ہیں جن سے چھوٹی چھوٹی بچتوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ہمیں رقم کی ضرورت ہے اور اس رقم کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ملکی بچت کا ذریعہ ہے۔

اب اہل دل اور اہل نظر ذرا اس ماحول کو ذہن میں رکھیں جب کہ ۱۹۱۲ء میں مولانا احمد رضا خاں نے مسلمانوں کو اس بات پر عمل کرنے کی تلقین کی تھی کہ وہ غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کریں اور زیادہ سے زیادہ پس انداز کریں اور آج کے ماحول پر نظر ڈالیں۔ جب کہ حکومتیں اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ عوام زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔ کیا آپ اب بھی قائل نہ ہوں گے مولانا کی دور اندیشی کے۔

کیا اب بھی آپ کو یقین نہ آئے گا کہ مولانا کی دور رس نگاہیں مستقبل کو کتنا صاف دیکھ رہی تھیں۔

کینز کو اس کی خدمات کے صلے میں اعلیٰ ترین خطاب مل سکتا ہے۔ اس بنا پر کہ اس نے وہ چیز دریافت کر لی تھی۔ جسے چوبیس سال قبل مولانا احمد رضا خاں بریلوی شائع کروا چکے تھے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس طرف ذرہ برابر توجہ نہ دی۔

(۲) اب آئیے دوسرے نکتے کی طرف مولانا نے فرمایا

''بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدر آباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بنک کھولیں''

یہ نکتہ معاشی نقطۂ نظر سے اس قدر اہم ہے کہ ہمیں مولانا احمد رضا خاں کی اقتصادی سمجھ بوجھ کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کے صرف چند بڑے بڑے شہروں میں بینک قائم تھے جن کی ملکیت انگریزوں یا ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی ۔ برصغیر میں ۱۹۴۰ء تک کوئی مسلم بینک موجود نہ تھا ۔ ۱۹۱۲ء میں بنک اور بنکوں کی اہمیت کا اندازہ لگا لینا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولانا کی نگاہوں سے معاشیات کے مستقبل کے اس اہم ادارے کی اہمیت پوشیدہ نہ رہ سکی اور انہوں نے مال دار مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے بنک قائم کریں ۔

سود کی بے پناہ مضرت رسانیوں کے متعلق مولانا احمد رضا خاں نے اپنی دیگر کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ لہذا یہ امر یہاں واضح ہے کہ مولانا احمد رضا خاں کی مراد ایسا بنک کاری نظام تھا جو غیر سودی بنیادوں پر استوار ہو ۔

جدید اقتصادی ڈھانچے بینکنگ بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ایک مستحکم بینکنگ نظام ملکی معیشت کو تازہ و صحت مند خون فراہم کرتا ہے ۔ بنک وہ ادارے ہیں جو لوگوں کی بچتوں کو پیداواری کاموں میں لگانے کا ذریعہ ہیں ۔ آج کا معاشی نظام بغیر بینکنگ کے عضو معطل ہو کر رہ جائیگا ۔ اسی وجہ سے موجودہ اقتصادی نظام کو ایک (Compound Interest System) کہا جاتا ہے ۔ یعنی ایک ایسا نظام جس کی بنیاد سود مرکب پر ہے ۔ ایسے نظام میں بنکوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اقتصادی منصوبہ بندی میں سرمایہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے ۔ کوئی بھی اقتصادی منصوبہ خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو بغیر سرمایہ کے تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتا ۔ اقتصادی ترقیاتی منصوبوں میں بنکوں کے سپرد یہ اہم کام ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ کی قلت کو دور کریں اور بچت اور سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کریں ۔ ایک مضبوط بینکنگ نظام چھوٹی چھوٹی بچتوں کو اس طرح یک جا کر کے کام میں لاتا ہے کہ اس کے ذریعے بڑے بڑے اقتصادی منصوبے پایۂ تکمیل کو جا پہونچتے ہیں ۔ اس طرح بنک دو اہم فرائض انجام دیتے ہیں ۔

(۱) وہ لوگوں کی چھوٹی یا بڑی رقمیں جمع کرتے ہیں ، اور

(۲) ان رقموں کو ایسے افراد کو قرض پر دے دیتے ہیں کہ جو انہیں پیداواری کاموں پر صرف کر سکیں ۔ پیداواری کاموں سے مراد ان کاموں سے ہے جن کا نتیجہ ایسی اشیاء و خدمات کی پیدائش میں ہوتا ہے جو مستقبل کی پیدائش دولت میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں ۔

تو گویا بنکوں کی اہمیت موجودہ معاشرہ میں مسلّم ہے ۔ قائدِ اعظم انتہائی دور اندیش اور مدبر سیاستدان تھے ۔ قیام پاکستان سے قبل یہ بات ان پر روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لیے ایک مضبوط بنک کی سخت ضرورت ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہو ۔ لہذا انہوں نے اس بات پر بے حد اصرار کیا کہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا بنک فوری طور پر قائم کیا جائے انہوں نے فرمایا کہ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک بنک (حبیب بینک) مسلمانوں کا ہے جب کہ ملک میں سینکڑوں بینک سرگرم عمل ہیں ۔ جن کی ملکیت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہے ۔ قائدِ اعظم کے مسلسل اصرار سے متاثر ہو کر مرحوم سر آدم جی داؤد اور مرزا احمد اصفہانی نے جن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا ۔ ۹ رجولائی ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں مسلم کمرشل بینک قائم کیا ۔ تقسیم ہند کے بعد اس بینک کے دفاتر پاکستان منتقل کر دیئے گئے اور بہت جلد اس بینک نے اپنی شاخیں پاکستان کے اہم شہروں میں قائم کر دیں اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی سرگرمیوں میں یہ بینک انتہائی اہم کردار ادا کر رہا ہے ۔

جدید ماہرین اقتصادیات نے پس اندازی کی دو قسمیں بنائی ہیں :

(۱) بچت (Saving) اور (۲) زر کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding)

اگر ایک فرد کی ماہانہ آمدنی ۱۰۰ روپے ہے جس میں سے وہ اسّی روپے اپنی ضروریات زندگی پر خرچ کرتا ہے تو اس کی ماہانہ بچت بیس روپے ہوگی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔ اگر قومی آمدنی قومی اخراجات کے مقابلے میں زیادہ ہے تو نتیجہ قومی بچت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اس بچائی ہوئی رقم کو افراد بینکوں میں جمع کرا سکتے ہیں یا بچت کی کسی اسکیم میں لگا سکتے ہیں۔ یہ صورت حال بچت کہلاتی ہے۔ لیکن اگر لوگ بچائی ہوئی رقم کو اپنے پاس ہی رکھیں تو یہ صورت (Hoarding) کہلائے گی۔ بچت کا تصور ذخیرہ اندوزی کے تصور سے اسلیئے مختلف ہے کہ موخر الذکر تصور خالص نفسیاتی ہے جس میں فرد کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ دولت زر کی شکل میں جمع کرے اور اسے اپنے پاس ہی محفوظ رکھے۔

جب تک لوگ اپنی بچت بینکوں میں جمع کرائیں گے یا کسی بچت کی اسکیم میں لگائیں گے اس وقت معیشت میں توازن برقرار رہے گا۔ لیکن جس وقت لوگوں میں زر کو ذخیرہ کرنے کی خواہش بڑھ جائے گی تو معیشت عدم توازن کا شکار ہو جائے گی کیونکہ کینز کی مساوات

بچت = سرمایہ کاری

غیر متوازن ہو گئی۔ ایسی صورت میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے معیشت میں یا تو افراط زر پیدا ہو جائے گا یا کساد بازاری پھیل جائیگی اور ہزاروں افراد و ملکی وسائل بے روزگار و بے اثر ہو جائیں گے جس میں معاشرہ میں بے شمار سماجی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔

اب بچت اور بینک کا تعلق قارئین پر واضح ہو گیا ہوگا اور انہیں یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ موجودہ معیشت میں بچت اور بینک ہماری اقتصادی زندگی کے لیے کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ بچت اور بینک آج کی دنیا میں دو ایسے الفاظ ہیں جن سے ہمارے معاشرے کا بچہ بچہ واقف ہو چکا ہے۔ ٹیلی ویژن دیکھئے، ریڈیو سنیئے، یا اخبارات کا مطالعہ کیجئے آپ کو ہر قدم پر ان دونوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ اقتصادی تعلیم محدود تھی کسے معلوم تھا کہ تیس چالیس سال کے بعد بچت اور بینک کس قدر اہمیت اختیار کر جائینگے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے مستقبل میں جھانک لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف فضول خرچی سے باز رکھنے کی تلقین کی بلکہ پس اندازی کی ہدایت کی بلکہ صاحب حیثیت اور دولت مند مسلمانان ہند سے اپیل کی کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے بینک قائم کریں، وہ بینک جہاں کم حیثیت کے مسلمان اپنی چھوٹی چھوٹی بچائی ہوئی رقم محفوظ رکھ سکیں اور جہاں سے با صلاحیت مسلمان آجروں کو سرمایہ فراہم ہو سکے اور وہ صنعت کاری کے میدان میں ہندوؤں کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکیں۔

پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا۔ ہندو مجبور ہو گیا تھا کہ وہ برصغیر کی تقسیم کو قبول کرے لیکن وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ معاشی طور پر پاکستان کی زندگی چند روزہ ہے۔ یہ ایک حقیقت بھی تھی، پاکستان کے خزانے خالی تھے۔ صنعت اور بینکنگ میں مسلمان ناتجربہ کار تھے۔ اس میدان میں گویا ایک خلا تھا جس کو تیزی کے ساتھ پر کرنا انتہائی ضروری تھا۔ پاکستان کے ارباب اقتدار کو اس خلا کو پر کرنے کے لیے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بے شمار تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خدا کے فضل و کرم سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ آخر تو یہ مملکت خداداد تھی جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔

میں سوچتا ہوں کہ کاش ۱۹۱۲ء میں چند ایک ہی ایسے اہل دل مسلمان ہوتے جو مولانا احمد رضا خاں کے ارشادات پر عمل کر لیتے تو مسلمانوں کی اقتصادی تاریخ برصغیر میں یقیناً مختلف ہوتی اور پاکستان کو انتہائی ناسازگار معاشی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ایسی گہری سوچ اور ایسے نکات جن کے نتائج اس قدر دور رس ہوں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو صرف مرد مومن کا

کمال ہے۔ اس مرد مومن نے تونگر مسلمانوں کو دعوت دی کہ مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا بینک قائم کرو تاکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت سنبھلے یہی بات ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے دوہرائی۔ اگر ۱۹۱۲ء میں سر آدم جی اور مرزا اصفہانی جیسے دو چار سرمایہ دار فاضل بریلوی کی ہدایت پر عمل کر لیتے تو مسلمانوں کا معاشی مستقبل بہت کچھ سنور جاتا اور اس کے اقتصادی نتائج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بلکہ مسلمانانِ عالم کے لیے بے حد خوشگوار ثابت ہوتے۔

اب ہم مولینا احمد رضا خاں کے تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا:

(۳) ''مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔''

ذرا اس نکتہ پر غور فرمائیے: موجودہ عالمی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ مسلمانوں نے اس عالم دین کے اس زرین اصول کو نہ تو سمجھا اور نہ ہی اس پر عمل کیا لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی یورپ کے جنگ سے متاثر ہونے والے ممالک نے اس پر پورا پورا عمل کیا اور آج یہ ممالک اقتصادی طور پر دنیا کے مستحکم ترین ممالک سمجھے جاتے ہیں۔

لکھنؤ میں میں نے اپنے بچپن میں جب کہ دوسری جنگِ عظیم زور شور سے جاری تھی۔ اکثر مسلمانوں کی دوکانوں پر یہ شعر چسپاں دیکھا تھا ؎

زندگی عزت کی مسلم ہند میں چاہے اگر
تو یہ لازم ہے کہ سودا جب بھی لے مسلم سے لے

یہ غالباً فاضل بریلوی کے اس نکتے کی بازگشت تھی۔ اس شعر نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ لیکن صاحب حیثیت مسلمانوں کو میں نے ہندوؤں کی دوکانوں سے خرید و فروخت کرتے دیکھا۔ مسلمانوں میں اس وقت بھی ماہرین اقتصادیات موجود تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی نگاہیں مغربی مفکرین کی جانب لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ خود ان کا ایک عالم، اقتصادیات کے بارے میں کیسے کیسے موتی ان کے سامنے بکھیر گیا ہے۔ وہ اپنے خزانے سے بے خبر رہے لیکن مغربی خزانوں کی طرف حسرت و یاس سے دیکھتے رہے اور کسی نے بھی مولانا کے اس نکتہ پر غور نہیں کیا، نہ ہی اسے سمجھا اور نہ ہی وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ اگر اس وقت کوئی بھی مسلم ماہر اقتصادیات اس نکتے کے دور رس اثرات کی وضاحت کر دیتا اور مسلمان صرف مسلمانوں ہی سے خرید و فروخت کرنے لگتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مسلمان ہندوستان میں معاشی اعتبار سے دوسری قوموں کے مقابلے میں پست ہوتے۔

معاشیات میں اس بات پر گرماگرم بحث ہوتی رہی ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے کہ بین الاقوامی تجارت آزاد ہونی چاہیئے یا اس پر پابندیاں ضروری ہیں۔ تامین (Proteeation) کے خلاف اور موافقت میں بڑے بڑے یوروپین اور امریکی ماہرین معاشیات نے دلائل پیش کئے ہیں۔ آدم اسمتھ (Adam Smith) کو جسے معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ آزاد بین الاقوامی تجارت کا سب سے بڑا حامی سمجھا جاتا ہے۔ آزاد عالمی تجارت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملکتوں کے مابین اشیاء و خدمات کی آمد و رفت پر پابندیاں نہیں ہیں یا اگر ہیں بھی تو برائے نام۔ اس کے برخلاف تامین وہ تحفظ ہے جو حکومت ملکی صنعتوں کو غیر ملکی مقابلے سے بچانے کے لیے دیتی ہے۔ آدم اسمتھ کی کتاب ''دولت اقوام'' ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۷۹۱ء میں امریکہ کے ایک سیاستدان الیگزینڈر ہملٹن Alexander Hamilton) نے تامین کی پالیسی کی پرزور حمایت کی اور آزاد بین الاقوامی تجارت کی مخالفت جرمنی میں فریڈرک لسٹ نے تامین کی حمایت میں پرزور دلائل دیئے۔ سب سے پرزور دلیل جو تامین کے حق میں دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی نوزائیدہ صنعتیں بیرونی مقابلے سے اس وجہ سے تحفظ کی مستحق ہیں کہ وہ مضبوط بیرونی صنعتوں کا اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں قطعاً مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ان کی حفاظت

حکومت کا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قبل ہی بیرونی مقابلے کے سامنے دم توڑ دیں۔

ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تابین اس لیے ضروری ہے کہ ملک کی دولت ملک ہی میں رہتی ہے اور روزگار میں اضافہ ہوتا ہے نیز یہ جذبۂ حب الوطنی کے فروغ کا باعث بنے۔

اور بھی بہت سے دلائل ہیں جو تابین کے حق میں دیئے گئے ہیں مگر میں صرف مندرجہ بالا دو دلائل کے متعلق مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تیسرے نکتے کی روشنی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے برصغیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا اور انگریزوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں انگریزی حکومت ہندوستان میں انتہائی مستحکم ہو چکی تھی۔ اس وقت کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف ۳۵ سال بعد فرنگی اس سرزمین کو چھوڑ کر بھاگ جائیگا۔

مسلمانوں کا اب اپنا کوئی ملک نہ تھا لیکن مسلم قوم اب بھی موجود تھی جسے اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ انہوں نے کیا گم کر دیا ہے حکومت ختم ہو چکی تھی مگر قوم اب بھی موجود تھی۔ اس قوم کی سماجی، مذہبی اور معاشی بقا کے لیے مضبوط بنیادوں پر اہلِ نظر اور اہل علم مسلمانوں کو پالیسیاں وضع کرنی تھیں۔ تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی میدان میں مسلم لیڈران سرگرم عمل تھے۔ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جد و جہد تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر کسی نے بھی مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور اس سے نمٹنے کے لیے کوئی پالیسی وضع نہ کی۔ اس موقع پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے معاشی نکات پیش کئے جن پر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے کوئی غور و فکر نہیں کیا تعلیم یافتہ مسلمان اپنی راہبری کے لیے مغربی علماء کا سہارا لے رہے تھے اور اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے درمیان ایک ایسے باوصف انسان کو بھیج دیا ہے کہ جس کے ارشادات پر اگر مسلمان عمل کرتے تو کب کے اپنی غربت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کر کے باعزت زندگی بسر کرنے لگتے۔

مولانا احمد رضا خاں کا تیسرا نکتہ میرے نزدیک معاشی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ وہ مسلمانوں کو معاشی تحفظ دینا چاہتے تھے۔ روزگار اور تجارت کے میدان میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ بنیوں کی ذہنیت اور فطرت ہی یہ تھی کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ روپیہ کمایا جائے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں کوئی تجربہ نہ تھا اور اگر مسلمان تجارت کرنا بھی چاہتے تو اول تو ہندو اپنے مقابلے میں انہیں میدان سے بھگا دیتے تھے اور دوسرے اپنوں کی بے اعتنائی ان کا دل توڑ دیتی تھی۔ فاضل بریلوی پر یہ باتیں روز روشن کی طرح عیاں تھیں۔ اس کا صرف ایک ہی علاج تھا اور وہ یہ کہ مسلمان مسلم تجارت پیشہ افراد کو تحفظ دیں اور خرید و فروخت صرف مسلمانوں ہی سے کریں یعنی فاضل بریلوی نے جدید اقتصادی زبان میں مسلمان دوکانداروں کے لیے مسلمان بھائیوں سے تابین کی اپیل کی۔ مسلمان دوکانداروں کی مثال بالکل نوزائیدہ صنعت کی سی تھی جسے سخت ترین بیرونی مقابلے کا سامنا تھا اور ان کی بقا اسی صورت میں تھی کہ مسلمان ان کی سرپرستی کریں۔ یہاں کسی ملکی صنعت کو تحفظ نہیں دینا تھا۔ بلکہ اپنی قوم کی اس جماعت کی حفاظت مقصود تھی جو معاشی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے کوشاں تھی۔

اب اگر مسلمانان ہند فاضل بریلوی کے ارشاد پر عمل کرتے تو اس کے اقتصادی نتائج کیا ہوتے؟ مسلمانوں کا پیسہ مسلمان دوکانداروں کے پاس جاتا۔ اپنے طور پر یہ مسلمان تاجر مسلمان تھوک فروشوں سے زیادہ سامان حاصل کرتے۔ مسلم تھوک فروش مسلم صنعت کاروں سے زائد اشیا خریدتے اور جب مؤثر طلب میں اس طرح اضافہ ہوتا تو مسلمان صنعت کار زیادہ اشیاء پیدا کرتے کیونکہ ان کی اشیاء کی طلب میں اضافہ ہوتا۔ اشیاء کو پیدا کرنے کے لیے وسائل پیدائش کی ضرورت ہوتی ہے یعنی زمین، محنت اور سرمائے کی۔ مسلمان

صنعت کار جب اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کرتے تو یقیناً وہ بے روزگار مسلمان جو تلاش روزگار میں سرگرداں تھے ملازمتیں حاصل کر لیتے اور جب ان افراد کی آمدنیوں میں اضافہ ہوتا تو ان کی مؤثر طلب بڑھ جاتی اور معاشیات کا وہ چکر شروع ہو جاتا جو کسی بھی معیشت کو خوشحال کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان صنعت کار سرمایہ کہاں سے لائیں تو اس کا جواب مولانا احمد رضا خاں کے چوتھے نکات میں پوشیدہ ہے کہ مسلمان بچت کریں اور صاحب حیثیت مسلمان بینک قائم کریں۔ بینک جن کا اولین مقصد پیداواری کاموں کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

کینز کے نظریہ "روزگار و آمدنی" میں مؤثر طلب (Effective Demand) بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تیسرے نکتہ میں مؤثر طلب کا خیال واضح طور پر موجود ہے۔ سارا کریڈٹ کینز کو جاتا ہے اور ہم اپنے امام کے ارشادات سے قطعاً بے خبر مغربی ماہرین معاشیات کو داد دیتے رہتے ہیں۔ قسمت کی اس ستم ظریفی کو ہم کیا نام دیں گے۔ خزانہ نعمت ہمارے سامنے لگا ہوا ہے لیکن ہماری نگاہیں مغرب کی ڈگر طبیل پر لگی ہوئی ہیں۔

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ فاضل بریلوی کے اس نکتے پر مغربی دنیا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کتنا عمل کیا ہے۔ مغربی یورپ کے ممالک مثلاً جرمنی، فرانس اور اٹلی وغیرہ اس جنگ میں تباہ و برباد ہو گئے تھے خصوصاً جرمنی اور اٹلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جرمنی کی "بندر بانٹ" ہوئی۔ ایک حصہ روسیوں کے پاس اور دوسرا اتحادیوں کے قبضے میں آیا۔ جرمنی دو حصوں میں تقسیم ہو کر مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی بن گیا۔ جرمنی کی اقتصادی و معاشی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ یہی حالت فرانس اور اٹلی کی تھی۔ لیکن جرمنی نے جلد ہی اپنی حالت کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ وہاں کے دانشمندوں نے یہ بات بخوبی سمجھ لی تھی کہ جرمنی کو اگر زندہ رکھنا ہے تو اقتصادی بحالی فوقیت کے لحاظ سے اول نمبر پر ہے۔ جنگ کی تباہی کے بعد مغربی جرمنی تنہا اپنی معیشت کو بحال نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا روم میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یورپین مشترکہ منڈی (uropean Common Market) کا قیام عمل میں آیا جو چھ مغربی یورپی ممالک پر مشتمل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عالمی سیاست میں امریکہ کا طوطی بول رہا تھا اور عالمی معیشت میں امریکی ڈالر کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس منڈی کے قیام کے پس پشت جو نظریہ کارفرما تھا وہ بعینہٖ وہی تھا جس کی ہدایت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے تیسرے نکتے میں فرمائی تھی یعنی مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں۔ معاہدہ روم جس کے تحت اس منڈی کا قیام عمل میں آیا تھا ان شرائط و ضوابط پر مشتمل تھا کہ منڈی کے اراکین ان اشیاء کو پیدا کریں گے جن کی پیدائش پر انہیں دوسرے ممالک پر فوقیت حاصل ہے۔ منڈی کے اراکین ممالک خود کو ایک وحدت خیال کریں گے۔ آپس میں تجارت آزادانہ ہو گی یعنی تجارت پر کوئی پابندی نہ ہو گی۔ وسائل پیدائش کی منتقلی پر پابندیاں نہ ہوں گی۔ درآمدات پر بھاری ٹیکس لگائے جائیں گے اور برآمدات رعایتوں کی مستحق ہوں گی۔ جو اشیاء منڈی کے اراکین پیدا کر سکتے ہیں انہیں باہر سے نہیں منگوایا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ خرید و فروخت آپس ہی میں ہو گی۔

منڈی کے قیام کے وقت غالباً اراکین کو بھی اس کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ یہ ادارہ انتہائی مستحکم اقتصادی ادارہ بن گیا۔ منڈی کے اراکین کی معیشت انتہائی مضبوط خطوط پر قائم ہوئی۔ مالی اعتبار سے اراکین کی حیثیت بے حد مضبوط ہو گئی اور ہم نے دیکھا کہ عالمی اقتصادیات میں امریکی ڈالر کی حیثیت ثانوی رہ گئی اور جرمن مارک دنیا کی مضبوط ترین کرنسی بن گیا۔

یورپین مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی نے معاشیات کی ایک نئی شاخ کو جنم دیا جسے ہم (Theory of Economic Integeration) کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔

مشترکہ منڈی کی اس شاندار کامیابی سے متاثر ہو کر یورپ کے تقریباً دس ممالک نے جس میں برطانیہ بھی شامل تھا ایک یوروپین فری ٹریڈ ایریا (European Free Trade Area) قائم کر لیا لیکن وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جو یوروپین مشترکہ منڈی کو ہوئی۔ پاکستان ایران اور ترکی کے مابین جو معاہدہ ہوا تھا اور جسے ہم آر۔ سی۔ ڈی کے نام سے جانتے ہیں۔ انہیں خطوط پر تھا لیکن اس ادارہ کو وہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ آر۔ سی۔ ڈی کو کامیاب بنانے کے لیے تینوں ممالک کے سربراہوں کی ایک کانفرنس ۲۶ر اپریل ۱۹۷۶ء کو ازمیر (ترکی) میں منعقد ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اگر تینوں ممالک صدق دل اور نیک نیتی سے اس ادارے کی کامیابی کے لیے کوشش کریں تو کامیابی نصیب نہ ہو۔

بہر حال اس تمام بحث سے غرض یہ تھی کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے جو نکتہ بیان فرمایا تھا اگر مسلمان صدق دل سے اس پر عمل کرتے تو انہیں بھی یقیناً وہی کامیابی ملتی جو یوروپین مشترکہ منڈی کے حصے میں آئی۔ ہمارے ایک عظیم عالم دین نے ہمارے لیے چراغ جلا کر رکھ دیا تھا جس کی روشنی میں ہمیں صحیح راستے کا تعین کرنا تھا لیکن افسوس راستے کا تعین تو در کنار ہم نے اس شمع ہدایت کو بھی نظر انداز کر دیا اسے ہم صرف اپنی بد نصیبی اور کوتاہ بینی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی اصطلاحات میں راہبران ملت ایسے الجھے کہ انہوں نے مسلمانوں کی اقتصادی اصلاح کی طرف توجہ نہ دی جو یقیناً حیرت انگیز اور قابل افسوس امر ہے جب کہ ان کی ہدایت کیلئے اتنے واضح نکات مولانا احمد رضا خاں نے ۱۹۱۲ء میں وضع فرما دیے تھے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا چوتھا نکتہ گو کہ اقتصادیات کے متعلق نہیں[1] لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

(۴) "علم دین کی نشر و ترویج و اشاعت کریں۔"

یہ وہ زمانہ تھا کہ سرسید کی تعلیمی اصلاحات کی کوششیں رنگ لا رہی تھیں۔ مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ انگریزی تعلیم کا حصول بذات خود ایک اچھی بات تھی۔ مسلمانوں کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ طلب علم ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن حرکات تشویشناک تھی اور جسے مولانا کی ذات گرامی نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل مغربی تہذیب کی بھی دلدادہ ہوتی جا رہی تھی یعنی کوا ہنس کی چال اختیار کر رہا تھا جو کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ فاضل بریلوی نے سمجھ لیا تھا کہ اگر مسلمان علم دین سے بے بہرہ ہو گئے تو وہ اپنی حیثیت و انفرادیت کو گم کر بیٹھیں گے۔ نئی تہذیب ان کی وحدت کو ختم کر دے گی اور ان کا وہی حال ہوگا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اکبر الہ آبادی نے بھی یہ بات بخوبی محسوس کر لی تھی اپنی شاعری کے تیز و تند نشتروں سے انہوں نے مسلمانوں کو اس خطرے

---

[1] یہ نکتہ بھی اس لحاظ سے اقتصادیات سے متعلق ہے کہ پہلے تین نکات پر عمل کا جذبہ قومی اور ملی تعصب سے پیدا ہوتا اور قومی تعصب و عصبیت کے لیے دینی تعلیم ضروری ہے تو بالواسطہ یہ آخری نکتہ بھی اقتصادیات اسلامی سے متعلق ہے۔ (ادارہ)

کا احساس دلایا۔ انہیں سمجھایا کہ اپنی اصلیت مت بھولو۔ تمہارا سب سے بڑا خزانہ تمہارا مذہب اور تمہاری تہذیب ہے۔ لیکن "رفارم" کا چکر اتنا تیز تھا کہ مسلمان اس طرف متوجہ نہ ہوئے اور اکبر الہ آبادی نے فرمایا کہ ؎

سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے رہے پیسہ نہ ملا

اور یہ کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

مغربی تہذیب نے ایسا رنگ جمایا اور نوجوانوں کو اپنی رنگینیوں کا ایسا متوالا بنایا کہ وہ اپنے معاشرے، تہذیب اور مذہب سے دور ہوتے چلے گئے اور فرنگی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے گئے۔

مذہب سے بیگانگی برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو بے حد نقصان پہنچایا لیکن جب قائداعظم محمد علی جناح نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہا تو مسلمان پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اسلامی غیرت وحمیت اس وقت بھی مسلمانانِ ہند میں موجود تھی جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مسلمانوں کو ایک نیا ملک نصیب ہوا جو اس بنیاد پر وجود میں آیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی ثقافت و تہذیب ہندوؤں سے مختلف ہے مگر بدنصیبی تو ملاحظہ فرمائیں کہ اسلام کے نام پر علیحدہ مملکت تو وجود میں آگئی مگر ترویج دین کی طرف اہل اقتدار نے کوئی توجہ نہ دی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مملکت اسلامیہ پاکستان کو صحیح طور پر ایک اسلامی ملک بنایا جاتا۔ اسلامی تعلیمات کی اشاعت ہوتی۔ نوجوانوں کو مذہبی تعلیم سے روشناس کرایا جاتا۔ انہیں بتایا جاتا کہ پاکستان کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے کس لیے جدوجہد کی تھی اور بے شمار قربانیاں کیوں دی گئیں تھیں لیکن افسوس کہ اس طرف سے توجہ ہٹالی گئی۔ اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ ابھی ملک کی جڑیں مضبوط بھی نہ ہوئی تھیں کہ طوفان حوادث نے اسے آگھیرا۔ مذہب سے بیگانگی نے اور بھی غضب ڈھایا۔ ہم نے خود کو صوبوں سے خصوصیت دے لی اور یہ بھول گئے کہ ہم اول و آخر صرف مسلمان ہیں۔

ہمارے ملک پر جو آفات نازل ہوئیں ان کا بنیادی سبب ہماری مذہب سے بیگانگی تھا۔ اگر ابتداء ہی سے علم دین کی ترویج و اشاعت پر زور دیا جاتا تو ہمیں یہ برے دن ہرگز نہ دیکھنا پڑتے۔

آج ہمیں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہماری نئی نسل کو جو مغرب کی تقلید میں دیوانی ہوئی جا رہی ہے۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اگر اس سلسلہ میں نیک نیتی سے کوششیں شروع کر دی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری نسل اپنی منزل کو نہ پالے۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال ؏

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

فاضل بریلوی اور چند یادداشتیں

مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی
اعزازی خطیب جامع مسجد آرام باغ

الحاج مولانا محمد اطہر نعیمی صاحب اعزازی خطیب جامع مسجد آرام باغ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ کئی کتابوں کو فارسی اور عربی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ موصوف کا مضمون ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جو وہ اپنے والد محترم شیخ الحدیث و التفسیر مفتی محمد عمر صاحب نعیمی قدس سرہ اور صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین صاحب قدس سرہ سے سنتے رہے ہیں۔ موصوف نے رکن ادارہ معارف رضا کی حیثیت سے اختصار سے کام لیا جس کے لیے راقم الحروف ان کا مشکور ہے۔ سید محمد ولایت علی قادری

قسامِ ازل نے بنی نوع انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس نوعِ انسانی کو وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ۔ کی بشارت سے سرفراز فرمایا۔ اس نوعِ انسانی کو انواع و اقسام کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا اور اپنی نعمتوں کی سرفرازی کی وجہ سے بہت سے لوگ بامِ عروج تک پہنچے۔ ان نعمتوں کے تفصیلی جائزہ کی نہ تو یہاں گنجائش ہے اور نہ ان پر تبصرہ مقصود ہے۔ ہمیں تو سر دست صرف ایک نعمت کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہے۔ درحقیقت یہ نعمت تمام نعمتوں سے افضل و اعلیٰ اور بلند و بالا ہے۔ یہ دولت شخصیات میں معیار مقرر کرتی ہے۔ معاشرہ کی تشکیل اور انسانیت کی تکمیل میں اعانت کرتی ہے۔ حضرت علی کا یہ شعر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا
لنا علم وللجہال مال

جناب حضرت علی کرم اللہ وجہہ قسامِ ازل کی تقسیم پر اظہارِ نیازمندی فرما رہے ہیں کہ اے خالقِ کائنات تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے ہمیں علم کی دولت سے مالا مال فرمایا۔ اور دنیاوی دولت جہال کو دے دی۔ تجربہ شاہد ہے کہ بہت سے مواقع ایسے آئے ہیں کہ زر و جواہر نے کوئی کام نہ دیا۔ اس وقت علم ہی نے کشتی کو منجدھار سے نکالا ہیں اگر یہاں موضوع کو تفصیل سے لکھوں تو مضمون طویل ہونے کا خوف ہے اسلئے نفسِ موضوع کی جانب آتے ہوئے عرض کروں کہ اربابِ علم نے سہولت اور آسانی کی خاطر علوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے "دینی علوم" اور "دنیاوی علوم" مجھے سر دست دینی علوم کے سلسلہ میں کچھ کہنا ہے کہ تقسیم کار اور آسانی کی خاطر علوم دین کو بھی چند اقسام میں تقسیم کیا گیا۔ تفسیر، اصول حدیث، فقہ اصول فقہ اور اسماء الرجال، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ایسا موضوع ہے جس پر صفحات کالے ہوتے چلے جائیں لیکن مضمون ختم نہ ہو۔ تفصیل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ افرادِ ملت نے علوم کی مختلف اقسام میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ علومِ اسلامیہ اور منطقی انداز میں فخر الدین رازی نے شہرتِ تمام حاصل کی ہے۔ فنِ تفسیر پر اگر نظر ڈالیں تو اتقان و جلالین علامہ جلال الدین سیوطی کا جیتا جاگتا شاہکار ہیں۔ علومِ تصوف میں فتوحاتِ مکیہ نے محی الدین ابنِ عربی کو شہرت کے بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے۔ غرضیکہ اربابِ علم نے کسی نہ کسی شعبہ کو اختیار کر کے شہرتِ دوام حاصل کی ہے۔ ایسے لوگوں کے حالات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ جن پر تبصرہ مضمون کی طوالت کا سبب ہوگا۔ اور اصل موضوع سے ہٹنے کا خطرہ بھی دامن گیر رہے گا۔

اس خیال کے مدِ نظر تمام تفاصیل اور تمہیدات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں کہ برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو خاندانِ ولی اللہی نے علم و فضل کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کے ڈنکے بجو لئے۔ اور اپنی قابلیتوں کے لوہے منوا لئے۔ لیکن جب اس خاندان کی ڈگر کو چھوڑ کر ایک صاحب نے

نئی روش اختیار کی تو بقول کسے لٹیا ہی ڈبادی اور اس خاندان کے نام کو بٹا لگوا دیا۔ برصغیر کے تمام اہلِ علم حضرات نے ایسی لعن طعن کی کہ موصوف کو علمی میدان کو خیرباد کہنا پڑا اور ان کبھی کہنے کے مطابق تصوف اور صاحبانِ تصوف کا سہارا لیا۔ جو موصوف کے نزدیک نہایت ہی مبغوض تھے۔ بہرحال خاندانِ ولی اللٰہی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے فخرِ ہندوستان تھا۔ خیرآباد سے فضل امام اور فضلِ حق نے علمی دنیا میں اپنا سکہ بٹھایا۔ بدایوں بھی علم و فضل کا مرکز رہا۔ غرضیکہ ہندوستان میں بہت سے خاندان مطلعِ علم پر ابھرتے رہے اور اپنے علم و فضل کا لوہا منواتے رہے۔ روہیلکھنڈ کے صدرِ مقام بریلی میں ایک علمی خاندان بستا تھا۔ جسکا علم و فضل مسلم تھا لیکن اس خاندان میں ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء میں ایک فرزند تولد ہوئے جنکا نام احمد رضا رکھا گیا۔

بالائے سرش زہوشمندی

می رفت ستارہ بلندی

شیخ سعدی کا مذکورہ بالا شعر اس فرزند کے مستقبل کا عکاس ہے۔ بچپن میں ذہانت و فراست کے عالم کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآنِ کریم ختم کر لیا تھا۔ بچپن کا دور ایسا گزرا کہ دیکھنے والے یہ کہتے تھے کہ ان کی زبان سے کبھی غلط اور قبیح لفظ سننے میں نہیں آیا۔ والدہ محترمہ فرماتی تھیں کہ ابتدائی دور میں استاد سے کبھی چوتھائی سے زیادہ کتاب نہ پڑھی۔ بقیہ کتاب کا مطالعہ خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ آپ کا گھریلو نام "احمد میاں" تھا۔ ایک مرتبہ استادِ محترم نے فرمایا تھا "احمد میاں" آپ انسان ہیں یا جن۔ مجھے پڑھاتے ہوئے دیر لگتی ہے لیکن آپکو یاد کرتے دیر نہیں لگتی۔

اسطرح بچپن کا دور گزرتا رہا اور یہ فرزند علمی میدان میں اپنے کمالات کا اظہار کرتے رہے۔ ابھی عمر شریف ۱۴ سال ہوئی تھی کہ علومِ متداولہ کی تکمیل کر لی۔ اور سندِ فراغت سے فیضیاب ہوئے۔ دورِ طالب علمی میں ہی فتویٰ نویسی شروع فرما دی تھی۔ اسوجہ سے احباب و اکابر نے آپ کو فاضل کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور وطنِ مالوف کی نسبت سے فاضل بریلوی کے لقب سے موسوم ہو گئے تھے۔

اخلاق و عادات

آپ کی زندگی کے لیل و نہار خلق اور عادات، صورت و سیرت الحب اللہ والبغض للہ کی آئینہ دار تھی۔ اگر کسی سے انس ہوتا تو اللہ کے لیے اور اگر کسی سے ناراضگی ہوتی تو اس میں بھی شریعت کا عنصر شامل ہوتا حق بات بلا خوف لومۃ لائم فرما دیتے اور اس میں بھی کسی کی ذاتیات سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

کیونکہ زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔ اسلیئے زیادہ تر مکان کے اندرونی حصہ میں بیٹھ کر اپنے ذوق کی علمی تکمیل فرمایا کرتے تھے۔ صرف نمازوں کے وقت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے اپنے حجرۂ عافیت سے باہر آتے یا ان مخصوص اوقات میں جو اپنے احباب سے ملاقات کے لیے مقرر تھے۔

والدِ محترم حضرت علامہ مولانا مفتی محمد عمر صاحب نعیمی قدس سرہٗ سے سنا ہے کہ فاضل بریلویؒ کی نشست میں میں نے کبھی کوئی دنیاوی بات نہیں سنی۔ ان کی مجلس میں اللہ رب العلمین اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور شرعی مسائل پر بات ہوتی تھی۔ مولانا محمد حسین صاحب میرٹھی (مرحوم و مدفون کراچی) جو کہ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ کراچی میں گو لیمار میں مقیم تھے۔ یہ حضرت اکثر والدِ محترم قدس سرہٗ کے پاس تشریف لاتے تھے اور جتنی دیر بیٹھتے فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حضرت اکثر بریلی حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بریلی میں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان سے متصل مسجد میں اعتکاف میں بھی بیٹھے تھے۔ اور اس دور کے بہت سے واقعات بڑے والہانہ انداز میں سنایا کرتے تھے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی مقدس بابرکت اور صاحبِ علم و فضل ذات کیساتھ کمالِ عقیدت و محبت اظہار تو کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کرتے ہیں لیکن ابھی تک (بشمول خود) کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی ذات کے بارے میں کوئی بھرپور کتاب سامنے آتی۔ اب تھوڑے عرصہ سے لوگوں کو احساس ہوا ہے اور اس سلسلہ میں پیش رفت ہوئی ہے۔ ناسپاسی ہوگی کہ اگر حکیم محمد موسیٰ صاحب مقیم لاہور کا تذکرہ نہ کروں۔ موصوف نے فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے مرکزی مجلسِ رضا کی بنیاد رکھی۔ اور محترمی ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کر کے "فاضل بریلوی اور ترکِ موالات" اور "فاضل بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں"، جیسی کتابیں مرتب فرمائیں جنکو مرکزی مجلسِ رضا نے چھاپ کر مفت تقسیم کیا۔

راقم الحروف نے فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کا تذکرہ والدِ محترم اور استادِ محترم صدر الفاضل مولانا محمد نعیم الدین صاحب مرآدآبادی سے سُنا ہے۔ انہیں میں سے چند باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ

کا عملی مظاہرہ

والدِ محترم فرمایا کرتے تھے کہ جب فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے قرآن مجید کا ترجمہ "کنز الایمان" مکمل فرمایا تو میری خواہش یہ ہوئی کہ میں اس کی اشاعت اپنے نعیمی پریس سے کروں۔ میں حاضرِ خدمت ہوا اور اس کی اشاعت کی اجازت لی۔ اب مرحلہ کتابت کا آیا تو میں تین کاتبوں کی کتابت کے نمونے لے کر بریلی حاضر ہوا تاکہ انہیں دکھا کر یہ منظوری لوں کہ کس سے کتابت کرائی جائے۔ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں جب نمونے پیش کیے تو آپ نے سب سے ادنیٰ تحریر کو پسند فرمایا۔ اباجان فرماتے تھے میں نے عرض کیا کہ یہ کاتب دوسرے دو کے مقابلے میں پست تر ہے تو آپ نے فرمایا "مجھے یہی اچھا معلوم ہوتا ہے"۔ اباجان فرماتے تھے معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ عقیدہ کے اعتبار سے یہی کاتب راسخ العقیدہ تھے۔ اور بقیہ دو کاتب راسخ العقیدہ نہ تھے۔ حالانکہ ان کے عقیدہ کے بارے میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

فاضل بریلویؒ اور صدر الافاضل کی ملاقات

مرادآباد میں ایک ایسی شخصیت تھی جنہیں شہر والے "ملاجی" کہتے تھے۔ ان کا نام محمد اشرف تھا۔ شاذلی سلسلۂ طریقت سے متعلق تھے۔ موصوف کو لکھنا پڑھنا بالکل نہ آتا تھا۔ لیکن ایک خصوصیت اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی تھی کہ قوتِ حافظہ غضب کی تھی۔ بدمذہبوں کی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں۔ اور ان کے حوالے مع صفحہ اور سطر کے یاد تھے۔ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ سے خصوصی تعلقات تھے۔ اور اکثر بریلی حاضری دیا کرتے تھے۔ ملاجی حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمۃ کی علمی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے۔ اور اکثر ان کے یہاں تشریف لاتے تھے۔

مرادآباد میں ایک صاحب "ہفت روزہ" شائع کرتے تھے۔ عقیدہ کے اعتبار سے ڈھل مل تھے۔ ان کے ہفت روزہ میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں مراسلہ نگار نے فاضل بریلوی کی شان میں بدترین زبان استعمال کی تھی۔ حضرت صدر الافاضل فرماتے تھے کہ اس مضمون کو پڑھکر مجھے سخت طیش آیا۔ اور نتیجہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے بخار ہو گیا۔ جب بخار سے افاقہ ہوا تو میں نے اس مضمون کا جواب لکھا اور اس ہفت روزہ کے مدیر کے پاس گیا۔ لیکن انہوں نے اس جواب کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب آپ اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ میرا جواب چھاپیں گے تو میرے ہمدرد اسکو خریدیں گے اور مراسلہ نگار جب میرے مضمون کا جواب دے گا تو اس کے ہمنواء اخبار کو خریدیں گے

میں جواب الجواب لکھوں گا۔ اسطرح آپ کے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور انہوں نے میرا مضمون چھاپ دیا۔ اخبار کا یہ مضمون فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پیش ہوا۔ جب ملا محمد اشرف صاحب بریلی گئے تو فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ نے صدر الافاضل کے بارے میں دریافت کیا تو ملاجی نے کہا کہ ایک صاحبزادہ ہیں۔ ابھی تو پوری طرح مسیں بھی نہیں بھیگیں۔ لیکن صاحبِ علم و فضل ہیں۔ فاضل بریلوی نے باندازِ دگر ملاقات کی خواہش فرمائی۔

ایک دن ملاجی صدر الافاضل کے ساتھ صبح کو سات بجے والی ٹرین سے روانہ ہوکر ساڑھے آٹھ بجے کے بعد بریلی پہنچے اس دن فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ مردانہ نشست میں موجود تھے ملاجی سے رسمی ملاقات اور حالات معلوم کرکے اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ اور ظہر کی اذان کے وقت زنان خانہ میں تشریف لے گئے۔ ملاجی کو اس دن فاضل بریلوی کے خلافِ معمول طرزِ عمل پر سخت غصہ آیا۔ دیاد رہے کہ ملاجی فاضل بریلوی کے مزاج میں بہت دخیل تھے اور فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ ان کا بہت لحاظ فرماتے تھے۔ نمازِ ظہر سے فراغت کے بعد ملاجی نے کہا "عجیب مولوی صاحب ہیں مہمان کو کھانے کو بھی نہیں کہا۔" حقیقت یہ ہے کہ ملاجی کو صدر الافاضل کے ساتھ اس طرزِ عمل پر سخت ندامت ہورہی تھی۔ حالانکہ فاضل بریلوی کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کرکے لئے اس کے برخلاف ہورہا تھا۔ صدر الافاضل نے فرمایا "ملاجی! کسی نان بائی کے یہاں نہیں گئے تھے جو روٹی کی بات کی جائے۔" عالم کے پاس گئے تھے علمی باتیں سنی ہیں۔ اس کے بعد صدر الافاضل اپنے ایک قریبی عزیز کے یہاں تشریف لے گئے اور کھانے کے بعد تھوڑا قیلولہ کرکے نمازِ عصر کے بعد پھر فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ملاجی نے صدر الافاضل کا تعارف کرایا تو فاضل بریلوی سخت ناراض ہوئے کہ صبح ہی تعارف کیوں نہیں کرایا تھا۔ اس پر ملاجی نے کہا آپ نے موقع ہی کہاں دیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں حضرات میں جو تعلقات استوار ہوئے اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ والدِ محترم فرمایا کرتے تھے کہ ہر ہفتہ ہی صدر الافاضل بریلی جاتے تھے اور اگر کبھی ناغہ ہوجاتا تو بریلی سے کوئی صاحب بلانے آجاتے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صدر الافاضل قدس سرہٗ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے معتمد ترین افراد میں سے تھے۔ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ فاضل بریلوی صدر الافاضل پر اتنا اعتماد فرماتے تھے کہ بعض اوقات صدر الافاضل فاضل بریلوی کے مسودات میں بعض سخت الفاظ کو تبدیل فرماتے ہوئے عرض کرتے حضرت میں نے اس کو اسطرح تبدیل کردیا ہے۔ تو فاضل بریلوی فرماتے "مولانا مجھے آپ پر اعتماد ہے اور آپ کو یہ اختیار حاصل ہے۔"

کوئی کام بغیر صدر الافاضل کے مشورے کے مکمل نہ ہوتا۔ تحریکِ خلافت پر گفتگو ہو یا کسی اور معاملہ میں کوئی اقدام مقصود ہو صدر الافاضل کا مشورہ حرفِ آخر ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ فاضل بریلوی کے فرزندِ اکبر حجۃ الاسلام مولینا حامد رضا خان صاحب آپ کا غایت درجہ احترام فرماتے تھے۔ اور مفتیِ اعظم ہند مولانا مصطفٰی رضا خان صاحب مدظلہ العالی ——— صدر الافاضل کا جو احترام فرماتے تھے وہ اپنی جگہ لیکن وہ والدِ محترم پر بھی بے پناہ شفقتیں فرماتے تھے۔

۱۹۶۳ء میں حج و جبہ مقدسہ سے واپسی پر والدِ محترم مفتیِ اعظم سے ملاقات کے لیے بریلی تشریف لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ ہمارے بریلی پہنچنے پر مفتی اعظم نے جس مسرت کا اظہار فرمایا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب رات کو مفتی اعظم کے دولت خانہ پر والدِ محترم اور

استادی مولانا محمد یونس صاحب (مرحوم) اور حضرت مفتی اعظم
تشریف رکھتے تھے، یہ اسوقت مدرسہ مظاہر اسلام کے مفتی صاحب
ڈاک لے کر آئے تاکہ مفتی اعظم فتاویٰ کے جواب لکھائیں تو مفتی اعظم
نے فرمایا۔ دیکھتے نہیں مولانا صاحب صرف ملاقات کے لیے تشریف
لائے ہیں۔ ان سے ملاقات کہاں ہوتی ہے یہ پاکستان سے آئے
ہیں۔ جوابات کل بھی لکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد جو گفت گو
شروع ہوئی تو اذانِ فجر ہو گئی۔ اور گفتگو کا انداز نہ بدلا۔

جملہ معترضہ کے بعد میں اپنے موضوع کی جانب آتا ہوں
فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار سے
زائد ہے۔ لیکن اس میں اب تک ایک تہائی بھی زیورِ طبع سے
آراستہ نہیں ہوئیں اور باقی اب تک مسوّدات کی شکل میں
الماریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

فاضل بریلوی کی ریاضی دانی

حضرت علامہ سید سلیمان اشرف
کی معیت میں دنیا کی مشہور
ریاضی داں شخصیت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی بریلی آمد کا واقعہ
تو شہرت اختیار کر گیا ہے لیکن ایک اور واقعہ بھی خالی از دلچسپی
نہ ہوگا۔ صوبہ یوپی کے ایک مشہور استاد ماسٹر محمد طیب صاحب
(مرحوم) جو کہ مسلم کالج مراد آباد میں ریاضی کے استاد تھے۔
وہ فرماتے تھے کہ میں دیوبند کا رہنے والا فاضل بریلوی کی ذات سے
کہاں عقیدت ہوتی۔ لیکن جب میں بریلی گیا تو وہاں بریلی کالج کے
ایک استاد کیساتھ فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے کتب خانہ میں
ریاضی کی جداول دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر
ضیاء الدین صاحب کی فاضل بریلوی کی خدمت میں حاضری کا
واقعہ جو سنتا تھا اس پر یقین کرنے میں تردد ہوتا تھا لیکن اب
احساس ہوا کہ وہ واقعہ درست ہی ہوگا۔

عادت و خصلت

ملا محمد اشرف صاحب مرحوم و مغفور
فرمایا کرتے تھے کہ فاضل بریلوی
گو نسلاً پٹھان تھے۔ لیکن ان کی پٹھانی صرف دشمنانِ دین
کے لیے تھی۔ ورنہ ایسے منکسر المزاج تھے کہ میں نے ایسا
منکسر المزاج شاید ہی کوئی دوسرا دیکھا ہو۔ سادات کرام
کے ساتھ تو انکسار کا یہ عالم ہوتا تھا جیسے ان کے سامنے بچھے
جا رہے ہوں۔

والد محترم قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ فاضل بریلوی تقریر
بہت ہی کم فرمایا کرتے تھے۔ سال میں صرف تین تقریریں معمولات
میں شامل تھیں۔ لیکن یہ تمام تقریریں سورۃ فتح کی پہلی آیات
پر ہوتی تھیں۔ اور ہر مرتبہ نئے نکات بیان فرماتے۔ کیونکہ آپ
علم کا بحر ذخار اور ناپیدا کنار تھے۔

والد محترم کی دستار بندی کے موقع پر مراد آباد تشریف
لائے تو اہل مراد آباد نے والہانہ استقبال کیا۔ چار گھوڑوں کی
گاڑی میں جلوس کی شکل میں اسٹیشن سے قیام گاہ تک لایا گیا
راستہ میں نعرہ ہائے تکبیر و رسالت بلند کرتے ہوئے جب مدرسہ
شاہی کے سامنے آئے تو منشی احمد حسین صاحب (جو نہایت ہی
جہیر الصوت تھے) نے گاڑی رکوائی اور فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ
کا یہ شعر بلند آواز سے پڑھا۔

یہ رضا کے نیزہ کی مار ہے کہ عدو کے سینہ میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ یہ وار وار سے پار ہے

رات کو شاہ بلاقی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے متصل
وسیع و عریض میدان میں جلسہ ہوا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے
قابل ہے کہ یہ وہی تاریخ ہے جس میں مولوی اشرف علی تھانوی
صاحب سے ان کی قابلِ اعتراض تحریروں کے سلسلہ میں گفتگو
(جسکو عرف عام میں مناظرہ بھی کہا جاتا ہے) ہونی تھی۔ لیکن
ان حضرات نے حسبِ عادت پولیس سے نقضِ امن کے اندیشہ
کے پیشِ نظر مناظرہ منسوخ کرا دیا تھا۔

فاضل بریلوی نے اپنی تقریر میں فرمایا مسلمانو! وہی دن

دی تاریخ اور وہی مقررہ جگہ ہے میں موجود ہوں۔ تھانوی صاحب نے پولیس کی مدد سے مناظرہ سے جان بچالی ہے لیکن میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ انہیں یہاں لے آؤ۔ اگر میرے سامنے آکر وہ مبہوت نہ ہوجائیں تو وہ جیتے میں ہارا۔ لیکن مولانا صاحب تشریف نہ لائے البتہ ایک صاحب نے آکر کہا کہ مولانا تھانوی صاحب جلسہ میں تشریف لانا چاہتے ہیں۔ فاضل بریلوی علیہ الرحمتہ نے فرمایا "پھر اجازت اور اطلاع کی کیا ضرورت ہے" ان کو تو یہاں آنا ہی تھا۔ وہ تشریف لائیں۔ لیکن قاصد نے کہا کہ آپ تحریری طور پر بلائیں۔ فاضل بریلوی نے فرمایا کیا آپ ان کی اس سلسلہ میں میرے پاس کوئی تحریر لے کر آئے ہیں؟ قاصد نے کہا نہیں۔ تب فاضل بریلوی نے فرمایا کہ زبانی بات کا جواب تو زبانی ہی ہوتا ہے۔ وہ تحریری طور پر اطلاع دیتے تو میں بھی تحریر دے کر بلا لیتا۔ اور یہ سب کچھ اسلیے کہا جا رہا تھا کہ فاضل بریلوی سے تحریر لے کر پولیس کو بتایا جائے کہ یہ تحریریں بھیج کر بلاتے ہیں تاکہ شہر کی فضاء کو مکدر کیا جائے لیکن فاضل بریلوی کی فراست کہ انہوں نے اس بات کو سمجھ لیا اور یہ تحریر نہ دی۔

اتباعِ سُنّت

مولوی سید محمد حسین صاحب میرٹھی (مرحوم) ان شخصیات میں سے تھے کہ ممکنہ حد تک اتباعِ سنّت کرتے تھے۔ اور کوئی موقع ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر ترکِ سنّت کرتے ہوں۔ نماز باجماعت کا تو وہ خصوصیت کے ساتھ اہتمام رکھتے تھے۔ مولانا صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ فاضل بریلوی قدس سرہٗ کا فیضِ صحبت ہے۔ میں نے تو ایسا متبع سنت اس دور میں دیکھا نہیں۔

جس دوران کہ مقدمہ بدایون کے سلسلے میں ناقابلِ ضمانت وارنٹ نکلے ہوئے تھے اس دوران بھی فاضل بریلوی قدس سرہٗ جماعت کو ترک نہ فرماتے اور مسجد میں باجماعت نماز ادا فرماتے تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں چونکہ ادارہ معارف رضاء اور الوفاق الصوفیاء کے خادموں میں سے ہوں لہٰذا میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ میں طویل مضمون لکھ کر دوسروں کے مضامین کے لیے جگہ ختم کروں۔ انشاء اللہ آئندہ اگر توفیق ایزدی شاملِ حال رہی تو اس مضمون کو مکمل کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فاضل بریلوی کے فیوض سے متمتع فرمائے۔ آمین ثم آمین ؎

سرور کہوں کہ مالک و مولیٰ کہوں تجھے
باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے

حرماں نصیب ہوں تجھے امید گہ کہوں
جانِ مراد کانِ تمنا کہوں تجھے

گلزارِ قدس کا گلِ رنگیں ادا کہوں
درماں دردِ بلبلِ شیدا کہوں تجھے

صبحِ وطن پہ شامِ غریباں کو دوں شرف
بیکس نواز گیسوؤں والا کہوں تجھے

اللہ رے تیرے جسمِ منور کی تابشیں
اے جانِ جاں میں جانِ تجلا کہوں تجھے

بے داغ لالہ یا قمرِ بے کلف کہوں
بے خار گلبنِ چمن آرا کہوں تجھے

مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا
یعنی شفیعِ روزِ جزا کہوں تجھے

اس مردہ دل کو مژدہ حیاتِ ابد کا دوں
تاب و توانِ جانِ مسیحا کہوں تجھے

تیرے تو وصف عیبِ تناہی سے ہیں بری
حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے

لیکن رضا نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

اعلیٰحضرت بریلوی

امام احمد رضا کا شخصیتی جائزہ

از:
ڈاکٹر مختار الدین آرزو

حضرت مولانا احمد رضا خان جنہیں اپنے وقت کے مشہور عالم حضرت مولانا عبدالمقتدر بدایونی نے "مجدد مائۃ حاضرہ" کا لقب دیا تھا اور جنہیں خواص اب بھی اسی لقب سے یاد کرتے ہیں، اسلامی دنیا میں اعلیٰحضرت فاضل بریلوی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مورث اعلیٰ قندھار کے قبیلہ بڑہیچ کے ایک باعظمت قبیلے کے ایک پٹھان سعید اللہ خان تھے جو مغلوں کی حکومت میں لاہور آئے اور معزز عہدوں پر فائز ہوئے۔ لاہور کا شیش محل انہی کی جاگیر تھا۔ جب وہ لاہور سے دہلی منتقل ہوئے تو وہ شش ہزاری عہدے پر متمکن تھے۔ ان کے بیٹے سعادت یار خاں کو حکومت مغلیہ نے ایک جنگی مہم سر کرنے کے لیے روہیل کھنڈ بھیجا۔ فتح یابی کے بعد ان کا یہیں انتقال ہوا۔ ان کے تین بیٹوں میں اعظم خاں بریلی آئے اور کچھ دن حکومت کے بعض اہم عہدوں پر فائز رہے پھر انہوں نے ترکِ دنیا کر کے بریلی میں سکونت اختیار کر لی۔ کاظم علی خاں بدایوں کے تحصیلدار انہی اعظم خاں کے بیٹے تھے جن کے پاس دو سو سواروں کی بٹالین تھی، اور جنہیں آٹھ گاؤں جاگیر میں ملے تھے۔ ان کے بیٹے رضا علی خاں (متوفی ۱۲۸۲ھ) تھے اپنے وقت کے قطب اور ولیِ کامل اور روہیل کھنڈ کے بزرگ ترین علماء میں تھے۔ اس خاندان میں انہی کے زمانے میں حکمرانی کا دور ختم ہو کر فقر و درویشی کا رنگ غالب آیا۔ ان کے صاحبزادے مولانا نقی علی خاں (م، ۱۲۹۷ھ) علوم ظاہری و باطنی دونوں سے متصف جلیل القدر عالم تھے۔ آپ کی تصنیف سرور القلوب فی ذکر مولد المحبوب اس زمانہ کی مقبول کتابوں میں ہے علامہ محمد حسن علمی جن کے لکھے ہوئے خطبات ہندوستان میں ہر جگہ رائج ہیں اور جمعہ و عیدین میں شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں انہی کا خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ حضرت ہی کے شاگرد تھے۔ وہ بے مثل مناظر اور بہت کامیاب مصنف بھی تھے۔ اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی انہی مولانا نقی علی خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کی ولادت بریلی میں دس شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۶ء کو ہوئی۔ ولادت کا سن ہجری اس آیت کریمہ سے مستخرج ہوتا ہے اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان نقش فرما دیا ہے اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی ہے۔

بسم اللہ خوانی کس عمر میں ہوئی معلوم نہیں لیکن اس قدر یقین ہے کہ بہت کم عمری میں ہوئی ہوگی اس لیے کہ چار سال کی عمر میں آپ نے قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا تھا اس سے آپ کی ذہانت و فراست کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بسم اللہ خوانی کا عجیب واقعہ پیش آیا۔ استاد نے بسم اللہ کے بعد الف با تا جس طرح پڑھایا جاتا ہے، پڑھایا، آپ پڑھتے رہے، جب (لام الف) کی نوبت آئی تو آپ خاموش رہے استاد نے دوبارہ کہا میاں، لام الف۔ آپ نے فرمایا یہ دونوں حرف تو پڑھ چکے ہیں ل بھی اور الف بھی، اب یہ دوبارہ کیوں؟ جد امجد مولانا رضا علی خاں موجود تھے بولے۔ بیٹا، استاد کا کہا مانو جو کہتے ہیں پڑھو۔ حضرت نے تعمیل کی اور جد امجد کی طرف دیکھا۔ وہ فراست سے سمجھ گئے کہ اس بچے کو شبہ ہو رہا ہے کہ یہ حروف مفردہ میں ایک مرکب لفظ کیسے آگیا۔ فرمایا بیٹا تمہارا شبہ درست ہے مگر شروع میں تم نے جو الف پڑھا ہے وہ دراصل ہمزہ ہے اور یہ درحقیقت الف ہے لیکن الف ہمیشہ ساکن ہوتا ہے اور ساکن کے ساتھ ابتدا ناممکن ہے اس لیے ایک حرف یعنی لام اول میں لا کر اس کا تلفظ بتانا مقصود ہے۔ آپ نے فرمایا تو کوئی ایک حرف ملا دینا کافی تھا۔ لام کی کیا خصوصیت ہے

باوجود اس سن بھی اوّل میں لاسکتے تھے۔ جدامجد نے غایت محبت وجوش میں گلے لگا لیا۔ دل سے دعائیں دیں اور پھر اس کی توجیہ ارشاد فرمائی۔
حیات اعلیٰ حضرت مؤلفہ ملک العلماء فاضل مولانا ظفرالدین قادری رضوی میں ان کے بچپن کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ ایک دو ٹکڑے آپ بھی سن لیجیے۔

ایک مولوی صاحب حضرت کو قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ کسی آیۂ کریمہ میں بار بار ایک لفظ انہیں بتاتے تھے مگر آپ کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ زبر بتاتے تھے آپ زیر پڑھتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت کے جدامجد نے انہیں اپنے پاس بلایا اور کلام پاک کا وہ نسخہ منگوا کر دیکھا تو اس کاتب سے اعراب کی غلطی ہوگئی تھی اور جس کی مطبع میں تصحیح نہیں ہوسکی تھی۔ جدامجد نے نسخے میں تصحیح کردی اور حضرت سے پوچھا جس طرح مولوی بتاتے تھے اس طرح کیوں نہیں پڑھتے تھے؟ فرمایا میں ارادہ کرتا تھا مگر زبان پر قابو نہ تھا۔

ایک روز مولوی صاحب موصوف حسب معمول بچوں کو پڑھا رہے تھے کہ ایک بچے نے آکر سلام کیا۔ مولوی صاحب نے کہا جیتے رہو۔ اس پر حضرت نے فرمایا یہ سلام کا جواب تو نہ ہوا۔ وعلیکم السلام کہنا چاہیئے تھا۔ مولوی صاحب سنکر بہت خوش ہوئے اور بہت دعائیں دیں۔

حضرت مولوی صاحب سے سبق پڑھتے تو ایک دو بار دیکھ کر کتاب بند کردیتے۔ استاد جب سبق سنتے تو لفظ بلفظ یاد۔ روزانہ یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب سخت متعجب ہوئے ایک دن کہنے لگے۔ امن میاں! یہ آپ کا بچپن کا نام ہے، تم آدمی ہو یا فرشتہ مجھ کو پڑھاتے دیر لگتی ہے مگر تم کو یاد کرتے دیر نہیں لگتی۔

اس قسم کے متعدد واقعات مولوی صاحب کو بارہا پیش آئے تو ایک روز تنہائی میں حضرت سے کہنے لگے، صاحبزادے سچ سچ بتادو میں کسی سے کہوں گا نہیں، تم انسان ہو یا جن؟ آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ میں انسان ہی ہوں بس اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم شامل حال ہے۔

ابتدائی زندگی کے حالات کم ملتے ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند مولفہ رحمٰن علی میں لکھا ہے کہ چار سال کی عمر میں قرآن شریف ناظرہ ختم کیا اور چھ سال کی عمر میں ماہ ربیع الاول شریف میں بہت بڑے مجمع کے سامنے میلاد شریف پڑھا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں مرزا غلام قادر بیگ اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر چودہ سال کی عمر میں تمام علوم درسیہ معقول ومنقول کی تکمیل اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خان سے کی ۱۴ر شعبان ۱۲۸۶ھ کو فاتحۂ فراغ ہوا۔ اسی دن رضاعت کے ایک مسئلے کا جواب لکھ کر والد ماجد کی خدمت میں پیش کیا جو بالکل صحیح تھا والد ماجد نے ذہن وطباع دیکھ کر اسی دن سے فتوی نویسی کا کام ان کے سپرد فرمایا۔ ۱۲۹۴ھ میں مارہرہ حاضر ہو کر حضرت سید شاہ آل رسول احمدی کے مرید ہوئے اور خلافت واجازت جمیع سلاسل وسند حدیث سے مشرف ہوئے۔ ۱۲۹۵ھ میں زیارت حرمین طیبین سے شرف وافتخار حاصل فرمایا اور اکابر علمائے دیار مثل حضرت سید احمد دحلان مفتی شافعیہ وحضرت عبدالرحمٰن سراج مفتی حنفیہ سے حدیث وفقہ واصول وتفسیر ودیگر علوم کی سند حاصل فرمائی۔ مصنف تذکرہ علمائے ہند راوی ہیں کہ ایک دن نماز مغرب مقام ابراہیم میں ادا کی کہ امام شافعیہ حضرت حسین بن صالح نے بلاتعارف سابق آپ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اپنے دولت خانے لے گئے اور دیر تک آپ کی پیشانی کو پکڑ کر فرماتے رہے "انی لاجد نور الله فی هذا الجبین" (بیشک میں اللہ کا نور اس پیشانی میں پاتا ہوں) اور صحاح ستہ اور سلسلہ قادریہ کی اجازت اپنے دست مبارک سے لکھ کر عنایت فرمائی۔ اس سند کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں امام بخاری تک فقط گیارہ واسطے ہیں۔

آپ کے اساتذہ کی فہرست بہت مختصر ہے۔ مکتب کے استاد جن کا نام معلوم نہیں اور مرزا غلام قادر بیگ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی والد ماجد سے علوم دینیہ کی تکمیل کی غالباً ۱۲۸۸ھ کا قصہ ہے آپ کو اپنے بعض اعزہ کے یہاں رام پور تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کے خسر شیخ فضل حسین مرحوم نواب کلب علی خانصاحب کے یہاں کسی اونچے عہدے پر مامور تھے ان سے حضرت کا ذکر آیا نواب صاحب چونکہ علمی ذوق

رکھتے تھے اور نوابوں، شعراء، فنکاروں اور اہلِ فن کی خاص جماعت ان کے دربار سے منسلک تھی اور وہ علمی و ادبی گفتگو کرتے رہتے تھے انہیں ایک ایسے لائق طالب علم سے ملنے کا اشتیاق ہوا جس نے چودہ سال کی عمر میں درسیات سے فراغت حاصل کرلی تھی جب حضرت نواب صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے خاص پلنگ پر بٹھایا اور وہ بہت لطف و محبت سے باتیں کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں انہوں نے فرمایا۔ آپ ماشاء اللہ فقہ و دینیات میں بہت کمال رکھتے ہیں، ہمارے یہاں مولانا عبدالحق خیرآبادی مشہور منطقی موجود ہیں بہتر ہو آپ ان سے کچھ منطق کی انتہائی کتابیں قدماء کی تصانیف سے پڑھ لیں۔ اتفاق سے اس وقت مولانا عبدالحق خیرآبادی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب نے تعارف کرایا اور فرمایا باوجود کم سنی کے ان کی سب کتابیں ختم ہیں اور فارغ التحصیل ہیں۔ مولانا خیرآبادی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ دنیا میں ڈھائی عالم ہیں۔ ایک مولانا بحر العلوم دوسرے والد مرحوم اور نصف بندہ ناچیز۔ وہ ایک کم عمر لڑکے کو کیا عالم ماننے پوچھا منطق میں انتہائی کتاب آپ نے کیا پڑھی ہے؟ جواب دیا۔ قاضی مبارک یہ سن کر دریافت کیا کہ شرح تہذیب پڑھ چکے ہیں حضرت نے فرمایا کیا جناب کے یہاں قاضی مبارک کے بعد شرح تہذیب پڑھائی جاتی ہے۔ علامہ خیرآبادی نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور پوچھا۔ بریلی میں آپ کا کیا شغل ہے؟ فرمایا۔ تدریس، تصنیف اور افتاء، پوچھا کس فن میں تصنیف کرتے ہیں۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا جس مسئلہ دینیہ میں ضرورت دیکھی اور رد وہابیہ میں علامہ نے فرمایا آپ بھی رد وہابیہ کرتے ہیں ایک وہ ہمارا بدایونی خبطی ہے کہ ہر وقت اسی خبط میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ اشارہ تاج الفحول محب الرسول حضرت مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی کی طرف تھا جو علامہ کے استاد بھائی دوست اور ساتھی تھے۔ اعلیٰحضرت آزردہ خاطر ہوئے اور بولے؛ جناب والا سب سے پہلے رد وہابیہ حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی حضور کے والد ماجد نے کیا اور تحقیق الفتوی فی سلب الطغوی نام کی کتاب رد وہابیہ میں تصنیف کی۔ بہرحال حضرت کے استاد ہونے کا فخر رامپور ہی کے ایک دوسرے عالم ہیئات کے مشہور فاضل مولانا عبدالعلی رامپوری کو حاصل ہوا جن سے حضرت نے شرح چغمینی کے کچھ اسباق لیئے آپ نے حضرت سید شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی سے علم تکسیر و جفر حاصل کئے ان کے علاوہ کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا، مگر فضل خدا اور ان کی محنت و خداداد ذہانت کی وجہ سے اتنے علوم و فنون کے جامع ہے کہ پچاس فنون میں آپ نے تصنیفات فرمائیں اور علوم و معارف کے وہ دریا بہائے کہ تلامذہ و معتقدین کا تو کہنا کیا معاصرین بھی جو ان کی شدت اور صلابت فی الدین کی وجہ سے آپ سے ناخوش تھے یہ کہنے پر مجبور تھے کہ مولانا احمد رضا خان قلم کے بادشاہ ہیں جس مسئلہ پر انہوں نے قلم اٹھا لیا موافق کو ضرورت اضافہ نہ مخالف کو دم زدن کی گنجائش

تلامذہ کی تعداد خاصی ہے مشاہیر میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خان مفتی اعظم حضرت مولانا مصطفےٰ رضا خاں متع اللہ المسلمین بطول بقاء، سلطان المناظرین مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی محدث اعظم مولانا سید محمد کچھوچھوی ملک العلماء فاضل بہار مولانا ظفرالدین قادری سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی، رئیس الاطباء مولانا سید حکیم عزیز غوث بریلوی قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰحضرت ۱۳ سلاسل کی اجازت و خلافت عطا فرمایا کرتے تھے۔ حرمین شریفین افریقہ، ہندوستان وغیرہ کے جن اکابر علماء اسلام کو ان سے اجازت و خلافت ہوئی ان میں کچھ مشہور و معروف حضرات کے اسمائے گرامی الاجازات المتینۃ اور الاستمداد میں درج ہیں ان میں مولانا سید محمد عبدالحئی محدث بلاد مغرب، شیخ صالح کمال سابق مفتی حنفیہ سید اسمٰعیل کی حافظ کتب خانہ حرم شریف مولانا مصطفےٰ بن خلیل مکی سید ابوحسین محمد مرزوقی مکی، شیخ اسعد دہان مکی، شیخ محمد عابد بن حسین، مکی مفتی مالکیہ وغیرہم اور ہندوستانی علماء میں حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خان بریلوی مفتی اعظم مولانا مصطفےٰ رضا خان متع اللہ المسلمین بطول بقائہ، ملک العلماء فاضل بہار مولانا ظفرالدین قادری صدر الشریعۃ مولانا امجد علی، صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی، شیخ المحدثین مولانا سید دیدار علی شاہ محدث لاہوری، مبلغ اعظم مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی حامی سنت مولانا عبدالسلام جبل پوری، سلطان الواعظین مولانا عبدالاحد پیلی بھیتی فاضل جلیل مولانا برہان الحق جبل پوری عالم حقانی مولانا سید فتح علی شاہ کھروڑ سیدان حامی شریعت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری، ماحیٔ بدعت مولانا ابومحمد امام الدین کوٹلی لوہاران

بجاب، قابلِ ذکر ہیں۔

ان کا ایمان کس قدر پختہ تھا اور سرور کائنات ﷺ کے ارشادات پر کس درجہ یقین تھا اس کی ایک مثال انہی کی زبان قلم سے سنیئے۔

بریلی میں مرض طاعون بشدت تھا، ایک دن میرے مسوڑھوں میں ورم ہوا اور اتنا بڑھا کہ حلق اور منہ بالکل بند ہو گیا۔ بخار بہت شدید اور کان کے پیچھے گلٹیاں طبیب نے بغور دیکھ کر سات آٹھ مرتبہ کہا، یہ وہی ہے یہ وہی ہے یعنی طاعون۔ میں بالکل کلام نہ کر سکتا تھا اس لئے انہیں جواب نہ دے سکا حالانکہ میں خوب جانتا تھا کہ یہ غلط کہہ رہے ہیں۔ نہ مجھے طاعون ہے اور نہ انشاء اللہ العزیز کبھی ہو گا اس لئے کہ میں نے طاعون زدہ کو دیکھ کر وہ دعا پڑھ لی ہے جسے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی بلا رسیدہ کو دیکھ کر یہ دعا پڑھ لے گا اس بلا سے محفوظ رہے گا وہ دعا یہ ہے الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا۔ جن جن امراض کے مریضوں، جن جن بلاؤں کے مبتلاؤں کو دیکھ کر میں نے اسے پڑھا الحمد للہ آج تک ان سب سے محفوظ ہوں اور بعونہ تعالیٰ ہمیشہ محفوظ رہوں گا مجھے ارشاد حدیث پر اطمینان تھا کہ مجھے طاعون کبھی نہ ہو گا آخر شب میں کرب بڑھا تو دل نے درگاہ الٰہی میں عرض کی اللھم صدق الحبیب وکذب الطبیب، کسی نے میرے داہنے کان پر منہ رکھ کر کہا مسواک اور سیاہ مرچیں۔ میں نے مسواک اور سیاہ مرچ کا اشارہ کیا۔ جب دونوں چیزیں آئیں اس وقت میں نے مسواک کے سہارے پر تھوڑا تھوڑا منہ کھولا۔ اور دانتوں میں مسواک رکھ کر سیاہ مرچ کا سفوف چھوڑ دیا۔ پسی ہوئی مرچیں اس راہ سے داڑھوں تک پہنچائیں تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ ایک کلی خالص خون کی آئی مگر کوئی تکلیف واذیت محسوس نہ ہوئی، اس کے بعد ایک کلی خون کی اور آئی اور بحمد للہ وہ گلٹیاں جاتی رہیں۔ منہ کھل گیا میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور طبیب صاحب سے کہلا بھیجا کہ آپ کا وہ طاعون بفضلہ تعالیٰ دفع ہو گیا، دو تین روز میں بخار بھی جاتا رہا۔

اسی طرح ایک بار کثرت مطالعہ کے سبب آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی اس وقت کا ایک بہت سر برآوردہ ڈاکٹر اندرسن نامی تھا اس نے معائنہ کے بعد کہا کہ کثرت کتب بینی سے آنکھوں میں یبوست آگئی ہے۔ پندرہ دن کتاب نہ دیکھیے، ان سے پندرہ دن بھی کتاب نہ چھوٹ سکی اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں۔

حکیم سید مولوی اشفاق حسین صاحب مرحوم سہسوانی ڈپٹی کلکٹر طبابت بھی کرتے تھے اور فقیر کے مہربان تھے فرمایا۔ مقدمۂ آب نزول ہے بیس برس بعد (خدا ناکردہ) آنکھوں میں پانی اتر جائے گا۔ میں نے التفات نہ کیا اور نزول آب والے کو دیکھ کر وہی دعا پڑھ لی اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پاک پر مطمئن ہو گیا۔ ۱۳۱۷ھ میں ایک اور حاذق طبیب کے سامنے ذکر آیا، کہا چار برس میں (خدانخواستہ) پانی اتر آئے گا۔ مجھے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر وہ اعتماد تھا کہ طبیبوں کے کہنے سے معاذ اللہ متزلزل ہوتا الحمد للہ بیس تو درکنار تیس برس سے زائد گزر چکے ہیں۔ نہ میں نے کتب بینی کم کی، نہ کروں گا میں نے یہ اس لئے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائم و باقی معجزات ہیں جو آج تک آنکھوں دیکھے جا رہے ہیں اور قیامت تک اہل ایمان مشاہدہ کریں گے۔

البتہ ایک بار اس دعا کے پڑھنے کا مجھے افسوس ہے۔ مجھے نوعمری میں اکثر آشوب چشم ہو جایا کرتا تھا اور بوجہ حدت مزاج بہت تکلیف دیتا تھا۔ ۱۹ سال کی عمر ہو گی کہ رام پور جاتے ہوئے ایک شخص کو آشوب چشم میں مبتلا دیکھ کر یہ دعا پڑھی جب سے اب تک آشوب چشم پھر نہیں ہوا۔ افسوس اس لئے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تین بیماریوں کو مکروہ نہ جانو، زکام کہ اس کی وجہ سے بہت سی بیماریوں کی جڑ کٹ جاتی ہے، کھجلی کہ اس سے امراض جلد۔ یہ جذام وغیرہ کا انسداد ہو جاتا ہے اور آشوب چشم کہ نابینائی کو دفع کرتا ہے۔

اعلیٰحضرت صوم وصلوٰۃ اور طہارت وغیرہ میں بہت احتیاط فرماتے تھے وضو میں بال کی جڑ تک پانی پہنچانے کا پورا اہتمام کرتے

گئے۔ کوشش بلیغ فرماتے تھے کہ ہر جگہ تھوڑے پانی آب ہو جائے اور بال برابر جگہ خشک نہ رہ جائے۔ اس مقصد کے لئے پانی کے دو لوٹے ان کے لئے رکھے جاتے تھے۔ بریلی میں جب ٹیوب ویل کا رواج ہوا تو اپنے یہاں فوراً لگوایا، لگوا کر بہت خوش ہوئے فرمایا اب کنواں میں چڑیاں کی بیٹ یا کسی نجاست کے گرنے کا احتمال نہیں رہا۔ جو کام الٹے ہاتھ کے کرنے کے ہیں ان کے علاوہ وہ ہر کام کی ابتدا سیدھے ہاتھ سے کرتے۔ عمامہ کا شملہ سیدھے شانہ پر رہتا عمامہ کے پیچ سیدھی جانب ہوتے۔ دروازہ مسجد کے زینے پر قدم رکھتے تو سیدھا صحن مسجد میں ایک صف بچھی رہتی تھی اس پر قدم پہنچتا تو سیدھا ہر صف پر تقدیم سیدھے قدم فرماتے یہاں تک کہ محراب میں مصلی پر قدم سیدھا ہی پہنچتا۔ اگر کسی کو کوئی چیز دینی ہوتی تو سیدھے ہاتھ میں دیتے اور بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶، عام طور سے جب لوگ لکھتے ہیں تو ابتدا الٹی طرف سے کرتے ہیں یعنی پہلے ۶ لکھتے ہیں پھر ۸ پھر ۷۔ اعلیٰ حضرت سیدھی طرف سے ابتدا کرتے تھے پہلے ۷ پھر ۸ پھر آخر میں ۶ تحریر فرماتے۔

تمام عمر جماعت سے مسجد میں آکر نماز پڑھی اور باوجودیکہ گرم مزاج کے تھے مگر کیسی ہی گرمی کیوں نہ ہو ہمیشہ عمامہ اور انگرکھے کے ساتھ نماز پڑھتے خصوصاً فرض نمازیں تو کبھی صرف ٹوپی اور کرتے میں ادا نہیں کیں ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر آپ مکان تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ مسجد آکر نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک صاحب جو خود حضرت کے پیچھے نماز پڑھ چکے تھے بہت متحیر ہوئے کہ بعد عصر نوافل نہیں اور اگر کسی وجہ سے نماز نہیں ہوئی تھی تو حضرت کا حافظہ ایسا نہیں تھا کہ مجھے بھول جاتے اور مطلع نہ فرماتے۔ جب حضرت نے سلام پھیرا تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور یہ نماز کیسی؟ فرمایا قعدۂ اخیرہ میں بعد تشہد سانس کی حرکت سے میرے انگرکھے کا بند ٹوٹ گیا تھا، چونکہ نماز تشہد پر ختم ہو جاتی ہے اس لئے میں نے آپ سے کچھ نہیں کہا اور گھر جا کر انگرکھے کا بند درست کرا کے اپنی نماز دوبارہ پڑھ لی۔

ایک مرتبہ آنکھوں میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی، متعدد بار ایسا اتفاق ہوا کہ کسی کو نماز کے بعد بلا کر پوچھتے کہ دیکھو تو آنکھ کے حلقے سے باہر پانی تو نہیں آیا ہے ورنہ وضو کر کے نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔

یہاں آپ کی بعض عادات و خصلات کا ذکر ضروری ہے۔ ہفتہ میں دو بار جمعہ اور سہ شنبہ کو لباس تبدیل فرماتے۔ ہاں اگر پنجشنبہ یا شنبہ کو یوم عیدین یا یوم النبی آکر پڑے تو دونوں دن لباس تبدیل فرماتے۔ ان دونوں تقریبوں کے علاوہ سوا یوم معین کے کسی اور وجہ سے لباس تبدیل نہ کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا وصی احمد محدث سورتی کے عرس سے پیلی بھیت سے واپسی صبح کی گاڑی سے ہوئی اعلیٰحضرت نے اس وقت اسٹیشن پر آکر وظیفے کی صندوقچی اپنے خادم خاص حاجی کفایت اللہ صاحب سے طلب فرمائی۔ کسی نے جلدی سے ویٹنگ روم سے اس زمانے کی لمبی آرام کرسی لاکر بچھا دی۔ دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ یہ تو بڑی متکبرانہ کرسی ہے جتنی دیر تک وظیفہ پڑھتے رہے آرام کرسی کے تکیے سے پشت مبارک نہ لگائی حضرت اپنا وقت کبھی بیکار نہیں فرماتے تھے۔ ہمہ وقت تالیف و تصنیف و فتاوی نویسی کا مشغلہ جاری رہتا اسی وجہ سے اندر کے کمرہ میں تشریف رکھتے تھے کہ باتوں میں کام نہیں ہوگا یا بہت ہی کم ہوگا۔ صرف پنجگانہ نماز کے لئے باہر تشریف لاتے تاکہ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں یا کسی مہمان سے ملنے کے لئے۔ جمعہ کو بعد نماز پھاٹک میں تشریف رکھتے۔ روزانہ عصر کی نماز پڑھ کر پھاٹک میں چارپائی پر تشریف رکھتے اور چاروں طرف کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ یہی وقت عام لوگوں کی ملاقات کا تھا۔ جب لوگ مسئلہ مسائل دریافت کرتے یا آپ خطوط کے جوابات دیتے یا استفتاء کے جوابات لکھواتے۔ اس وقت علوم و فیوض و برکات کے دریا جاری ہوتے اور حاضرین آستانہ مستفیض ہوا کرتے۔ مغرب کی نماز کے بعد زنانہ مکان میں تشریف لے جاتے اور وہیں تصنیف و تالیف و کتب بینی اور اوراد و اشغال میں مصروف رہتے۔

آپ حدیث کی کتابوں کے اوپر کوئی دوسری کتاب نہ رکھتے۔ اگر اقوال رسول کی ترجمانی فرما رہے ہیں اور اس درمیان میں کوئی شخص بات کاٹتا تو سخت کبیدہ خاطر ہوتے ایک پاؤں دوسرے پاؤں کے زانو پر رکھ کر بیٹھنے کو ناپسند فرماتے میلاد شریف کی مجلسوں میں شروع سے آخر تک ادباً دو زانو بیٹھا کرتے اور اسی طرح دو زانو بیٹھ کر وعظ فرماتے۔ چار چار پانچ پانچ گھنٹے منبر پر تقریر کرنا ہوتا جب بھی زانو نہ بدلتے کبھی ٹھٹھا

نہ کھاتے جماہی آتے ہی انگلی دانتوں میں دبا لیتے۔ قبلہ کی طرف کبھی پاؤں نہ پھیلاتے۔ بغیر صوف پڑی دوات سے لکھنا پسند نہ کرتے۔ یونہی لوہے کی نب سے اجتناب کرتے۔ خط بنواتے وقت اپنا کنگھا اور شیشہ استعمال فرماتے۔ آخر عمر میں پان کھانا چھوڑ دیا تھا ورنہ پہلے کثرت سے پان استعمال کرتے تھے مگر بغیر تمباکو کے۔ بوقت وعظ پان مطلق نہ کھاتے، ہاں ایک چھوٹی سی صراحی شیشے کی پاس رکھی ہوئی ہوتی اس سے خشکی رفع کرنے کے لئے غرارہ کر لیا کرتے۔

اعلیٰحضرت نحیف الجثہ اور نہایت قلیل الغذا تھے ان کی عام غذا چکی کے پسے ہوئے آٹے کی روٹی اور بکری کا قورمہ تھا۔ آخر عمر میں ان کی غذا اور بھی کم رہ گئی تھی ایک پیالی شوربا بکری کا بغیر مرچ کا ایک یا ڈیڑھ بسکٹ سوجی کا کھانے پینے کے معاملے میں اس قدر سادہ مزاج تھے کہ ایک بار بیگم صاحبہ نے انکی علمی مصروفیت دیکھ کر جہاں وہ کاغذات اور کتابیں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے دسترخوان بچھا کر قورمہ کا پیالہ رکھدیا اور چپاتیاں دسترخوان کے ایک گوشے میں لپیٹ دیں کہ ٹھنڈی نہ ہوجائیں۔ کچھ دیر بعد وہ دیکھنے تشریف لائیں کہ حضرت کھانا تناول فرما چکے یا نہیں تو یہ دیکھ حیرت زدہ رہ گئیں کہ سالن آپ نے نوش فرمالیا ہے لیکن چپاتیاں دسترخوان میں اسی طرح لپٹی رکھی ہوئی ہیں۔ پوچھنے پر آپ نے فرمایا چپاتیاں تو میں نے دیکھی نہیں میں سمجھا ابھی نہیں پکی ہیں۔ میں نے اطمینان سے بوٹیاں کھالیں اور شوربا پی لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ حیات اعلیٰحضرت میں لکھا ہے کہ رمضان المبارک کے زمانے میں افطار کے بعد پان نوش فرماتے سحری میں صرف ایک پیالے میں فیرنی اور ایک پیالے میں چٹنی آیا کرتی تھی وہی نوش فرمایا کرتے تھے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت فیرنی اور چٹنی کا کیا جوڑ؟ فرمایا نمک سے کھانا شروع کرنا اور نمک ہی پر ختم کرنا سنت ہے۔

آپ نے امور دنیا سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ آپ کے آباؤ اجداد سلاطین دہلی کے دربار میں اچھے منصبوں پر فائز تھے۔ جب آپ نے آنکھ کھولی تو گردوپیش امارت و ثروت کی فضا پائی۔ خود زمیندار تھے لیکن ساری جائیداد کا کام دوسرے عزیزوں کے سپرد تھا۔ انہیں کتابوں کی خریداری، سادات کی مہمان نوازی اور گھر کے اخراجات کے لئے ماہانہ ایک رقم مل جاتی تھی چونکہ داد و دہش کے عادی تھے اس لئے کبھی ایسا ہوا ہے کہ ٹھہلان میں پاس اکثر سے زائد موجود نہیں رہے لیکن انہوں نے کبھی نہیں پوچھا کہ گاؤں کی آمدنی کتنی آئی اور مجھے کتنی ملی۔

ایک جگہ خود تحریر فرماتے ہیں۔ الحمد للہ میں نے مال من حیث ہو مال سے کبھی محبت نہ رکھی صرف انفاق فی سبیل اللہ کے لئے اس سے محبت ہے۔ اسی طرح اولاد من حیث ھو اولاد سے بھی محبت نہیں صرف اس سبب سے کہ صلہ رحم عمل نیک ہے۔ اس کا سبب اولاد ہے اور یہ میری اختیاری بات نہیں میری طبیعت کا تقاضا ہے۔

ملک العلماء حضرت مولانا ظفرالدین صاحب قادری کو ایک ذاتی خط میں تحریر فرماتے ہیں "خط کے جواب میں یہ چاہا تھا کہ آیات و احادیث در بارۂ ذم دنیا و منع التفات بقول اہل دنیا لکھ کر بھیجوں مگر وہ سب بفضلہ تعالیٰ آپ کے پیش نظر ہیں، فلاں کو دست غیب ہے، فلاں کو عہدہ آبادیں رسوخ ہے۔ یہ تو دیکھا مگر یہ نہ دیکھا کہ آپ کے پاس بعونہ تعالیٰ علم نافع ہے، ثبات علی السنۃ ہے۔ ان کے پاس علم نفع یا علم مضر ہے۔ اب کون زائد ہے کس پر نعمت حق بیشتر ہے بشرط ایمان و مدہ علو و غلبہ باعتبار دین ہے۔ نہ یہ کہ دنیوی امور میں مومنین کو تفوق ہے۔ دنیا سجن مومن ہے سجن میں جتنا آرام مل رہا ہے کیا محض فضل نہیں۔ دنیا فاحشہ ہے اپنے طالب سے بھاگتی ہے اور ہارب کے پیچھے دوڑتی ہے۔ دنیا میں مومن کا قوت کفاف بس ہے۔"

تحریک خلافت کے زمانے میں گاندھی جی پورے ملک کا طوفانی دورہ کر رہے تھے مسلمان عوام کے ساتھ علماء کو بھی اپنا ہم خیال بنا رہے تھے اور تحریک خلافت کی طرف انہیں متوجہ کر رہے تھے۔ حضرت مولانا قیام الدین و عبدالباری فرنگی محلی تحریک سے متاثر ہو چکے تھے اور فرنگی محل میں گاندھی جی علی برادران اور دوسرے سیاسی اکابر آتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو خیال ہوا کہ بریلی میں مولانا احمد رضا خاں صاحب سے مل کر انہیں بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقے پر ان کا اثر ہے۔ اس طرح بہت سے مسلمان

تحریکِ خلافت کا ساتھ دے سکیں گے ایک صاحب ایک دن بہت خوش خوش آئے اور گاندھی جی کا پیغام حضرت کے پاس لائے کہ وہ بریلی آکر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے بہت مختصر جواب دیا فرمایا۔ گاندھی جی کسی دینی مسئلے کے متعلق مجھ سے باتیں کریں گے یا دنیوی معاملات پر گفتگو کریں گے۔ اور دنیاوی معاملہ میں میں کیا حصہ لوں گا جبکہ میں نے اپنی دنیا چھوڑ رکھی ہے اور دنیوی معاملات سے کبھی کوئی غرض نہیں رکھا۔

آپ کی صلابت مذہبی و حق گوئی کا ایک واقعہ سنئے۔ حضرت ایک بار مولانا فضل رسول بدایونی قدس سرہ العزیز کے عرس میں مارہرہ تشریف لے گئے۔ کسی نے مولوی سراج الدین صاحب آنولوی کو میلاد شریف پڑھنے بٹھادیا۔ انہوں نے اثنائے تقریر میں کہا کہ قیامت کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں فرشتے روح ڈالیں گے۔ چونکہ اس میں حیاتِ انبیاء علیہم السلام کے مسلمہ اصول سے انکار نکلتا تھا سن کر حضرت کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ انہوں نے مولانا عبدالقادر سے فرمایا آپ اجازت دیں تو میں اُن کو منبر پر سے اتار دوں عبدالقادر نے مقرر کو بیان سے روک دیا اور مولانا عبدالغفور صاحب سے فرمایا کہ مولانا ایسے لوگوں کو مولانا احمد رضا خانصاحب کے سامنے میلاد شریف پڑھنے کو نہ بٹھایا کیجئے جن کے سامنے بیان کرنے والے کے لیے علم اور زبان کو بہت نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

آپ کی ذات الحبّ للہ والبغض للہ کی زندہ تصویر تھی۔ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھنے والے کو اپنا عزیز سمجھتے اور اللہ و رسول کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھتے، اپنے مخالف سے کبھی کج خلقی سے پیش نہ آئے۔ کبھی دشمن سے بھی سخت کلامی نہ فرمائی بلکہ حلم سے کام لیا لیکن دین کے دشمن سے کبھی نرمی نہ برتی۔ اعلیٰحضرت کی زندگی کا ہر گوشہ اتباعِ سنّت کے انوار سے منور ہے۔ آپ نے بعض مردہ سنتوں کو زندہ کیا انہی میں نمازِ جمعہ کی اذانِ ثانی ہے جس کو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی سنت کے مطابق خطیب کے سامنے دروازہ مسجد پر دلوانے کا رواج قائم کیا۔

آج ہندوستان، پاکستان، افریقہ، افغانستان، کاشغر اور دوسرے ممالک میں جہاں جہاں جمعہ کی اذانِ ثانی دروازہ مسجد پر دی جارہی ہے وہ آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اعلیٰحضرت اس امر پر اعتقاد رکھتے تھے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور حضور اقدس تبلیغ و ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور علمائے کرام ورثۃ الانبیاء ہیں اسی طرح اس پر یقین رکھتے تھے کہ علماء کے ذمے دو فرض ہیں۔ ایک تو شریعت مطہرہ پر پورے طور پر عمل کرنا دوسرے مسلمانوں کو ان کے دینی مسائل سے واقف کرنا اس لئے جہاں کسی کو خلاف شرع کرتے ہوئے دیکھتے فرضِ تبلیغ بجالاتے اور اس کو اپنے فرائض میں داخل سمجھتے

مصنف حیاتِ اعلیٰحضرت لکھتے ہیں۔ آپ کے سب کام محض اللہ تعالیٰ کے لیے تھے، نہ کسی کی تعریف سے مطلب نہ کسی کی ملامت کا خوف تھا حدیث شریف (من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان) کے مصداق تھے آپ کسی سے محبت کرتے تو اللہ ہی کے لیے مخالفت کرتے تو اللہ ہی کے لیے۔ کسی کو کچھ دیتے تو اللہ ہی کے لیے اور کسی کو منع کرتے تو اللہ ہی کے لیے۔ اگر وہ بد مذہبوں اور بے دینوں پر اشد تھے تو دینداروں اور علماء اہلسنت کے لیے "رحماء بینہم"، کی زندہ تصویر بھی تھے۔ حضرت تاج الفحول محب الرسول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی قدس سرہ العزیز کی بہت عزت کرتے تھے اپنے قصیدہ آمال الابرار و آلام الاشرار میں علمائے اہلسنت کی تعریف فرمایا ہے۔

> اذا حلوا تمھت الایادی   اذا راحوا فصار المعربید

یہ علمائے کرام ایسے ہیں جب کسی ویرانے میں اترتے ہیں تو ان کے دم قدم سے ویرانہ پر رونق شہر ہوجاتا ہے اور جب روانہ ہوتے ہیں تو شہر ویرانہ بن جاتا ہے۔ مصنف حیاتِ اعلیٰحضرت لکھتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یہ محض مبالغہ شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا نہیں بالکل واقعہ ہے۔ حضرت مولانا عبدالقادر کی یہی شان تھی جب تشریف لایا کرتے تو شہر کی حالت بدل جاتی تھی عجیب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی اور جب تشریف لے جاتے تو باوجودیکہ سب لوگ موجود ہوتے مگر ایک ویرانی اور اداسی چھا جاتی۔

امام احمد رضا ایشیا کا عظیم محقق

از
مولانا عبد الکریم

محترم مولانا عبد الکریم صاحب یعنی بنگلہ دیش کے مشہور و معروف مذہبی رہنما ہیں سنی کاز کے فروغ اور خدمت سنیت میں آپ کا نمایاں حصہ رہا ہے دینی تعلیم کی مشہور درسگاہ مدرسہ عزیزیہ جلالیہ اسلامیہ پوسٹ لطف گنج ضلع فریدپور کے مہتمم ہیں آپ کا زیر نظر تحقیقی مقالہ شکریہ کے ساتھ حاضر ہے ——— (ادارہ)

یہ مسلم بات ہے کہ قوموں کا ارتقاء و استحکام سلف کے کارناموں سے آگاہی حاصل کرکے ان کے نقش قدم پر عمل پیرا ہو کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ ملت کے نونہال، مذہب اسلام کے جلیل القدر فرزندوں کی سیرت پاک سے آشنا ہو کر ہی نیا ولولہ، عزم و ہمت اور کامرانی کا راستہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اکابر ملت کی سیرت کے نقوش و آثار جس قدر دل کی گہرائیوں میں اترتے جائیں گے اسی قدر کامیابی کی منزلیں آسان سے آسان تر ہوتی چلی جائیں گی۔ اور عظیم شخصیتوں کے نمایاں کارناموں کا تصور جس قدر دھندلا جائے گا اتنا ہی مقصد کا حصول مشکل تر ہوتا جائے گا۔

تقریباً ہر دور میں ایسے افراد انسانی بکثرت پائے گئے جنہوں نے حق و صداقت کے خلاف آواز اٹھائی۔ باطل کی پشت پناہی کی لیکن ان کا طرز عمل مختلف رہا ہے کسی نے کھل کر باطل کی اشاعت کی اور حق کی مخالفت کی تو کسی نے اہل اقتدار کا دامن تھام کر اپنی ناپاک سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ایسے اشخاص بھی کچھ کم نہیں ہوتے جنہوں نے اہل حق کا لبادہ اوڑھ کر اپنی سکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جدوجہد کی۔ غرض یہ سلسلہ بہت دیر سے شروع ہے لیکن مردان حق کی کوششوں نے ہمیشہ ایسے لوگوں کے عزائم کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کی پرخلوص مساعی جمیلہ نے فریب کاروں کے گھناؤنے منصوبوں کا پردہ چاک کرکے بروقت سیدھے سادے مسلمانوں کا تعلق سرکار ابد قرار مدنی تاجدار احمد مختار نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم سے مضبوط اور مستحکم کر دیا۔ یہ حضرات کرام داد و تحسین یا طعن و تشنیع سے قطعاً ماورا ہو کر عوام و خواص کو ملت بیضاء دین متین اسلام کی نورانی تعلیمات کی یاد دہانی کراتے رہے۔

اہل اسلام کے انہی عظیم محسنوں اور راہنمائی میں تحقیق و تدقیق کے بادشاہ شریعت و طریقت کے آگاہ امام اہلسنت موجودہ صدی کے مجدد شیخ الاسلام والمسلمین حجۃ اللہ فی الارضین اعلیٰحضرت امام احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس نے اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی خدمات انجام دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ان کے علاوہ دیگر مسلمان بادشاہ بھی حتی الامکان اپنے فرائض سے غافل نہ رہے۔ ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی بھی اسلامی تعلیمات کے تعارف کے لیے معاون ثابت ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی سے لیکر مغل خاندان کے آخری چشم و چراغ تک مسلمان بادشاہوں نے ملت اسلامیہ کی بقاء و استحکام کے لیے حد امکان کوششیں کیں۔ ان فرمانرواؤں میں محمد تغلق اور حضرت شاہ اورنگ زیب کے نام نامی سرفہرست نظر آتے ہیں۔

۴ بادشاہوں کی اس جدوجہد اور کاوشوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بھی ضرور ماننا پڑے گا کہ ائمہ دین۔ اولیائے کرام۔ صالحین اور علمائے ربانی بھی تبلیغ اسلام و تعلیم دین متین کے فرائض سے غافل نہیں رہے۔ اگر ہم ان کی حیات طیبہ کا بغور مطالعہ کرتے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کی دینی و ملی خدمات بادشاہوں کے مقابلہ میں زیادہ بھی ہیں اور گراں بہا بھی۔ ان علمائے کرام کی فہرست میں صوفیائے کرام کے علاوہ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی حضرت شاہ عبدالعزیز حضرت مجدد الف ثانی سرہندی، حضرت عبدالقادر بدایونی وغیرہم کے علاوہ ایسے علمائے ربانیین بھی ہیں جنہیں ہم علمائے متاخرین کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔

ان علمائے متاخرین میں حضرت امام احمد رضا مجدد بریلوی کا نام نامی و اسم گرامی سرفہرست ہے۔ انہوں نے اس عالم رنگ و بو میں اس وقت آنکھ کھولی جب مغلیہ خاندان کا اقتدار آخری سانس لے رہا تھا۔ ان کا بچپن اس وقت کا آئینہ دار ہے جب برصغیر ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہوچکا تھا۔ انہیں شعور زندگی اس وقت نصیب ہوا جب ہندوستانی مسلمان انگریزوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے۔ مذہبی قدریں زوال پذیر تھیں۔ بدمذہبی و لادینی کا دور دورہ تھا۔ فرق باطلہ ہندوستان بھر میں اپنے آہنی پنجے پیوست کرنے کی خاطر ہر ممکن و غیر ممکن کوششوں میں مبتلا تھے تو مذہب کا سیلاب اور شتم رسالت کا طوفان برپا تھا۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو مجروح ہوچکا تھا۔ مذہب مہذب اہلسنت کے رہنما یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اب مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا؟

اس سلسلے میں ملت اسلامیہ کے صحیح و سچے رہنماؤں نے اپنے مخصوص اندازوں میں قوم کو جھنجھوڑ نے انہیں ماضی کی جھلک دکھانے و بیدار کرنے کی حتی المقدور کوشش کیں مگر حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اور کفر و ضلالت اور بدمذہبی و لادینی کی تاریک گھٹاؤں نے ہر طرف ڈیرے ڈالنے شروع کردیئے۔ ایسے نازک و پرآشوب وقت میں امام احمد رضا بریلوی نے اسلام و ناموس رسالت کے تحفظ و بقا کے لیئے تن من دھن کی بازی لگادی اور مسلمانوں کی بے دریغ اور بے لوث خدمات انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔

علمائے کرام کا بیان ہے کہ بارہویں و تیرہویں دو صدیوں میں دنیائے اسلام میں اعلیحضرت جیسے جامع و مانع متصف بہمہ صفات کوئی عالم پیدا نہیں ہوا۔ آپ کی ذات گرامی بے شمار اوصاف و محاسن اپنے اندر لیئے ہوئے ہے۔ جلالت علمی و کمال عملی میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ وسعت علم اور رائے کی پختگی میں پورے دور میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ خدمت دین متین میں جس خلوص سعی مسلسل اور بے باکی کا آپ نے مظاہرہ فرمایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا ایک دفعہ افسوس کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری عمر سے دس گنا زیادہ کام میرے ذمے فرمادیا ہے اگر دس آدمی میری امداد کو ہوتے تو جو کچھ سینے میں ہے کسی قدر باہر آجاتا۔ اور ایک دفعہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے میری عمر سے دس گنا زیادہ کام لے لیا ہے یہ اس کا انتہائی فضل و کرم ہے۔

ایشیا کا عظیم محقق

حقیقت بھی یہ ہے کہ جس نے آپ کی خدمت فیضدرجت میں حاضری دی اس نے برملا اس بات کا اعتراف کیا کہ آپ علم و فضل کے بحر ناپیدا کنار ہیں۔ آپ کی ایک ہزار کے لگ بھگ تصنیفات آج بھی اس بات کی صداقت پہ شاہد عدل ہیں۔ صرف فتاوے رضویہ ہی کو لیجیے اس میں آپ نے ہزاروں مسائل پر بے لاگ تحقیق و تدقیق فرمائی ہے آپ کی تصنیفات کے مطالعہ کرنے والوں کو پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ آپ قلم کے بادشاہ ہیں اور کتاب و سنت اور علمائے ملت کے فرمودات پر بہت ہی گہری نظر رکھتے ہیں جس نے فتاوے رضویہ کی جلد اول کا مطالعہ کیا وہ اس بات کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اعلیحضرت آپ اس صدی کے مجدد تھے پچاس علم و فنون میں آپ کے تحریری شہ پارے موجود ہیں۔

شعبان ۱۲۸۶ھ سے لیکر ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ تک پورے چون برس مسند افتا پر متمکن رہے اور اس عرصہ میں اتنا لکھا کہ حضرت علامہ الحاج مولانا شاہ محمد حسنین رضا خاں صاحب مد ظلہ العالی کا قول ہے صفحات کتابت و تحریر کئے گئے۔ قوت تحریر کا یہ عالم تھا کہ کوئی سوال آیا تو اس کے

جواب میں دلائل کا انبار لگ جاتا پھر بھی آپ کے قلم حقیقت رقم کو سیری نہ ہوتی تھی۔ آپ کی ایک ایک کتاب معلومات کا خزینہ اور تحقیقات کا گنجینہ ہے اور بے شمار حقائق و معارف سے مملو ہے۔ ہر تصنیف کا نام ایسا پیارا اور دلکش ہے جسے پڑھ کر اہل علم عش عش کر اٹھتے ہیں۔ ہر کتاب کا نام حسین و جمیل اور فقروں کی صورت میں علم و ادب میں ڈوبا ہوا، فصاحت و بلاغت میں ڈوبا ہوا اور معانی و بیان کی میزان پر وزن کیا ہوا ہے۔ اور جس کتاب میں جس موضوع پر کلام ہے اس کے نام میں مختصر طور پر اس کا بیان ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر تصنیف کا تاریخی نام ہے اسی طرح ہر کتاب کے شروع میں اس میں بیان شدہ مسئلے کے مطابق علیحدہ علیحدہ عربی خطبہ ہے جو آپ کے علمی تبحر پر شاہد عدل ہیں۔

آپ کے تبحر علمی کو صرف علمائے ہند ہی نہیں بلکہ ایشیا، عرب و عجم خصوصاً مدینہ اور مکہ کے مفتیان مذاہب اربعہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں آپ کی معلومات مذہبی علوم کے علاوہ سائنسی فنون کے متعلق تھیں وہاں آپ کی نظر ملکی سیاست اس دور کے مسائل پر بھی ویسے ہی تھی اور "اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام" وغیرہ "آپ کی اس موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے۔

تحریک آزادی

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے انگریز نواز علماء کے خلاف قلم اٹھایا۔ آپ ہی نے انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعے سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ مگر افسوس کہ اکثر مورخین کی ستم ظریفی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ جو لوگ انگریزوں کے اشاروں پر شب و روز مصروف کار رہا کرتے تھے اور انہی کی رضامندی حاصل کرنے کیلئے فرزندان اسلام کو کافر و مشرک قرار دے کر افتراق و انتشار پھیلاتے تھے بلکہ مسلمانوں کے خون میں ہاتھ رنگ کر مسرت محسوس کرتے تھے آج انہیں شہید مجاہد۔ اور تحریک آزادی کے قائد جیسے القاب سے مشہور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ حضرات جنہوں نے ببانگ دہل کفار سے نفرت دلائی اور ان کی تعلیم کرنے کا سبق سکھایا انہیں تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر تاریخ کے اوراق میں جگہ دینے سے بھی انکار کیا گیا بلکہ یہ کوشش کی گئی کہ صفحہ قرطاس میں ان عظیم جاں نثاروں کا ذکر بھی نہ آنے پاتے خود ہم میں سے بہت کم افراد ایسے ہوں گے جو مجاہد ملت اسیر انڈمن علامہ فضل حق خیرآبادی، شاہ احمد اللہ مدارسی مفتی عنایت احمد کاکوری علامہ کافی اعلیٰحضرت بریلوی، صدر الافاضل امیر ملت پیر جماعت علی شاہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مجاہدانہ کارناموں سے واقف ہوں گے یہی وہ بزرگ ہیں جن کی مجاہدانہ یلغاروں سے انگریزی حکومت بوکھلا اٹھی اور سامراجیت کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا۔

حالیہ دور میں پریس کی طاقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جن جماعتوں کے پاس نشر و اشاعت کے ذرائع ہیں وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہیں اور جن کے پاس پریس نہیں وہ بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارا کوئی ادیب، کوئی شاعر، کوئی صحافی اس خصوصی موضوع پر قلم اٹھانا گوارا نہیں کرتا اور اگر کبھی ایسی جرأت کرتا بھی ہے تو اس کی نگارشات پریس پر قابض حضرات کی مصلحت اندیشی کی نذر ہو جاتی ہیں۔

شعر و شاعری

باوجود اس کے کہ آپ جملہ علوم دینیہ کے علاوہ جفر نجوم ریاضی اور تکسیر وغیرہ علوم و فنون میں نادر روزگار تھے۔ آپ شعر گوئی میں یا بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شاعری آپ کا مشغلہ نہ تھا اور نہ ہی اس کے لئے کوئی تیاری وغیرہ کرتے بلکہ جب بھی مدینہ طیبہ خاک بغداد کی یاد کے دریا موجزن ہوتے تو بے ساختہ محبت و الفت کے جذبات شعروں کے سانچے میں ڈھل کر زبان پر آجاتے۔ آپ کی بیشتر نعتوں میں بے ساختگی سوز و گداز کیف و جذب، فصاحت و بلاغت جوش بیان اور پاس شریعت غرض آپ کے کلام میں ہر طرح کا حسن صوری و معنوی بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ کے نعتیہ کلام کو جام کوثر کہا جائے تو یقیناً بجا ہوگا۔ آپ کا نعتیہ کلام اہل ایمان و محبت کے ساز روح کا دلنواز نغمہ معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ذوق سلیم رکھنے والے حضرات آپ کے کلام کو سن کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ آپ خود تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں۔

یہی کہتی ہے بلبل باغ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں نہیں ہند میں واصف شاہ ہدیٰ مجھے شوخی طبع رضا کی قسم

برصغیر ہند و پاک میں اہل محبت کی شاید ہی کوئی محفل ایسی ہو گی جہاں آپ کے کلام اور مشہور زمانہ سلام "مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام" کی گونج

سنائی نہ دے۔ آخر کیوں نہ ہو آپ کی نعتوں کے ایک ایک شعر سے شہنشاہ مدینہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں۔

گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان　　　کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے

اکثر شعراء جوش شاعری میں کچھ کا کچھ کہہ جایا کرتے ہیں، مبالغہ آرائی کی سطح پر آ کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں مگر امام بریلوی نے شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی اور نعت گوئی کی ایک حد فاصل قائم کر دی۔ آپ کی نعتوں میں کہیں بھی شان رسالت کی گستاخی و بے ادبی کا پہلو نہیں نکلتا اور نہ ہی دامن شریعت آپ کے ہاتھ سے چھوٹتا نہ ہی کہیں حد سے تجاوز پایا جاتا ہے۔ اپنی نعت گوئی کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ　　　بے جا سے ہے المنۃ للہ محفوظ

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی　　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

بے شک ایک عالم دین کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و ثنا تو آپ کی غذائے روح۔ ذرا انداز کلام دیکھیئے

اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ　　　ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ

قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں　　　ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

آپ کے فن نعت گوئی اور شاعرانہ کمال کا اعتراف بڑے بڑے علماء اساتذہ فن نے کیا ہے۔ کسی محفل میں آپ کی یہ نعت

وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمان نقص جہاں نہیں　　　یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

سنکر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اظہار خیال کیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "یہ تو کوئی استاذ الاساتذہ معلوم ہوتے ہیں شاعری اسی کا نام ہے" امام بریلوی سے اختلاف کرنے والے ممکن ہے بہت سے حضرات ملیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ کے کمال نعت گوئی سے کسی کو اختلاف ہو۔ آپ کی نعت گوئی میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ ویسے ہٹ دھرمی کا کوئی علاج نہیں۔

آپ نے بڑی خوبی سے احادیث اور آیات قرآنیہ کا اقتباس اپنے منظومات میں شامل کیا۔ چونکہ آپ عربی و فارسی وغیرہ زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اسلئے بلا تکلف ہر زبان میں شعر کہتے تھے۔ آپ کی ایک نعت شریف کا پہلا شعر یہ ہے۔

لم یات نظیرک فی نظر مثل تو نہ شد پیدا جانا

جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

یہ نعت چار زبانوں کے حسین امتزاج کا مرقع ہے۔ اس سے آپ کی جدت طرازی اور ایجاد کی قوت کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

کاش کوئی مرد خدا امام بریلوی کے نعتیہ کلام کی طرف توجہ کرتا اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کرتا بلکہ اس کی مبسوط شرح لکھ کر علمی دنیا میں اسے پوری طرح متعارف کراتا۔ آپ کی شاعری کا محور ہی عشق مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعظیم انبیاء کرام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زبان و قلم کبھی کسی دنیا کے تاجدار کی قصیدہ خوانی سے ملوث نہیں ہوئی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا

میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

عشق رسولؐ و امام بریلوی

مسلمانوں کا حقیقی سرمایہ درحقیقت عشق رسولؐ ہی ہے صحابۂ کرام تابعین تبع تابعین اغواث اقطاب ابدال اور اولیائے عظام کی زندگیوں کے مطالعہ کے بعد نظر اسی نکتہ پر رکتی ہے کہ ان سب حضرات کی زندگی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محور پر گھومتی رہی، صحابۂ کرام کے جاں نثاروں، تابعین ۔ ۔ ۔ تابعین و سلف صالحین کا جذبۂ تبلیغ، امامین

اور فقہا کے دینی اجتہادات، اغواث، اقطاب ابدال اور اولیائے کرام کی ریاضتیں اور محاسبہ نفس کا مرکز حقیقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہا ہے۔

رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد بھی یہی ہے کہ ان کی ذات والا صفات کو ان کا امتی اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں اور مال و متاع سے زیادہ عزیز رکھتا ہوگا: بزرگان سلف کی مبارک زندگیوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد حیات صرف اور صرف عشقِ رسول ہی تھا۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار برس تک اس دنیا میں اپنا اقتدار قائم رکھا اور آج بھی ان کی برتری کا راز اسی مرکز سے وابستگی میں مضمر ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

حضرت امام بریلوی کی زندگی کا اصل مقصد عشق رسول ہی ہے اور حُبِ مصطفےٰ ہی ان کی حیات کا مظہر ہے۔ تا دم حیات آپ کی ظاہری و باطنی زندگی میں عشق نبوی کی روشنی برابر جگمگا رہی تھی۔ جہاں تک آپ کی ظاہری زندگی کا تعلق ہے۔ آپ نے علوم دینیات، علم تفسیر اور علم حدیث کی تکمیل صرف چودہ سال کی عمر میں کرلی تھی۔ آپ کے والد بزرگوار نے جو آپ کے استاد محترم بھی تھے آپ کو صرف چودہ سال کی عمر میں فتاویٰ نویسی کی سند اور اجازت دیدی تھی۔ اس کم سنی میں مذکورہ علوم کی تکمیل نے اللہ جل مجدہ اور اس کے پیارے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق ان کے دل میں جاگزیں کردیا تھا۔

علاوہ بریں عشق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ورثہ میں بھی ملا تھا۔ آپ کے اجداد و اسلاف میں اولیاء کرام کے نام ہی آتے ہیں جس کا اثر آپ کی ظاہری زندگی پر جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے وقت سے موت کی آغوش میں سو جانے تک زندگی کے کسی شعبے میں بھی آپ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے گریز نہیں فرمایا۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کا اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، چلنا، پھرنا تک کتاب و سنت کے مطابق انجام پاتا تھا۔ جب آپ سونے کے لئے لیٹتے تو لفظ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل بنا لیتے۔ عشق رسولؐ کی اس انتہا کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ جذبہ لاانتہا ہی نہیں تھا۔

حضور نبی غیب دان صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے ہر گوشے کا مطالعہ کرنے کے بعد جب حضرت امام بریلوی کے اخلاق و کردار اور زندگی پاک کے ہر شعبہ کا تجزیہ کیا جائے۔ تو یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہوجاتی ہے کہ حضرت امام بریلوی حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو اور ان کے عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔

اب رہی آپ کی باطنی زندگی، سو حقیقت یہ ہے کہ ظاہری زندگی باطنی زندگی کے نور کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ انسان اسی وقت مدارج کمال طے کر سکتا ہے جب اس کے ظاہر و باطن میں اتحاد اور یکسانیت پائی جائے۔ اس یکسانیت و یگانگت میں ظاہری زندگی تو معاون ہوتی ہی ہے مگر ظاہر ہی سے جو اجزاء عبادات سے متعلق ہیں وہ زیادہ معاونت کرتے ہیں۔ یہ اجزاء دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں پہلے حصے کو حقوق العباد کہتے ہیں اور دوسرے حصے کو حقوق اللہ کہتے ہیں۔

حقوق العباد کی فہرست میں اطاعت والدین کے علاوہ بزرگوں کا ادب چھوٹوں پر شفقت، عزیز و اقارب اور احباب کی دلداری، اولاد کی نگرانی علما کا احترام، حاجیوں کی تکریم اور سادات کی تعظیم سب کچھ آتا ہے۔ جس میں حضرت امام بریلوی ہر طرح پورے اترے حقوق اللہ میں بھی آپ کے زہد و ریاضت، محاسبۂ نفس، تصوف وغیرہ نمایاں اوصاف آپ کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھے۔ اس طرح باطنی اعتبار سے آپ کا پایہ بہت بلند اور اونچا قرار پاتا ہے جنکی دلیل وہ کرامات ہیں جو وقتاً فوقتاً ظہور میں آتی رہتی تھیں۔ مریدین اور معتقدین کی کثیر تعداد ایک طرح بر آپ کی باطنی ترقی اور عروج کی آئینہ دار ہے۔ یہ سب کچھ دوسرے معنوں میں عشقِ رسولؐ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

عشق رسول کا صلہ

دوسری دفعہ آپ ۱۳۲۳ھ میں حج وزیارت کے لیے گئے حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے پہونچنے کے قبل ہی آپ کے خداداد علم وفضل کا شہرہ وہاں پہونچ چکا تھا۔ امام بریلوی مدینہ طیبہ کی حاضری کے لیے بیتاب تھے لیکن شدید علالت سفر میں مانع تھی۔ ادھر مدینہ منورہ کے علمائے کرام ایک نظر آپ کی زیارت حاصل کرنے کو بے قرار تھے شیخ الدلائل حضرت مولانا شاہ عبدالحق مہاجر مکی علیہ الرحمتہ کے مخلص شاگرد حضرت مولانا کریم اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمتہ کا بیان ہے کہ ہم سالہا سال سے مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں۔ اطراف وآفاق سے علما آتے ہیں اور جوتیاں چٹخاتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں پوچھتا۔ لیکن امام بریلوی کے پہونچنے سے پہلے ہی علما تو علما اہل بازار تک آپ کی زیارت وملاقات کے مشتاق تھے۔ چنانچہ جب مدینہ منورہ میں آپ کی حاضری ہوئی اور آمد کی خبر ہر طرف پھیلی تو صبح سے عشا تک آپ کے پاس علمائے مدینہ کا ہجوم رہتا تھا۔ ملاقات وزیارت کرنے والوں کی بھیڑ بارہ بجے رات سے پہلے ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

(تذکرہ نوری ص)

جب آپ سنہری گنبد میں آرام فرمانے والے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ بیکس پناہ میں دل بیتاب اور روح بے قرار لیکر حاضر ہوئے اس وقت دل میں یہ تمنا ابھری کہ کاش مجھے اس جمالِ جہاں آرا کی زیارت بیداری کی حالت میں ہو جائے (خواب میں تو کئی دفعہ زیارت سے نوازے جا چکے ہیں) مواجہہ شریف میں کھڑے ہو کر دیر تک درود شریف پڑھتے رہے۔ لیکن پہلی شب مراد بر نہ آئی۔ کبیدہ خاطر ہو کر ایک غزل تحریر فرمائی جس کا مطلع یہ تھا۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں ترے دن اے بہار پھرتے ہیں

آخری شعر میں انتہائی انکساری اور بے کسی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔

کوئی کیوں پوچھے تری بات رضا تجھ سے کتے ہزار پھرتے ہیں

یہ غزل مواجہہ شریف میں پڑھ کر ادب وشوق کی تصویر بنکر کھڑے ہو گئے کہ قسمت بیدار ہوئی دلکی آرزو مراد کو پہونچی اور حضور رؤف ورحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زیارت سے بیداری میں مشرف ہوئے۔ سبحان اللہ عشق رسول کا کیا صلہ ملا۔

اسی جیسا واقعہ چھٹی صدی کے ولی کامل سیدنا حضرت احمد کبیر رحمتہ اللہ علیہ کے حق میں رونما ہوا تھا۔ ۵۵۵ھ میں آپ برائے حج بیت اللہ لے گئے اور بعد حج پیادہ پا چلتے ہوتے مدینہ طیبہ پہونچے۔ بعد نماز عصر حرم شریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوتے اس وقت نوے ہزار سے زیادہ زوار حرم مبارک کے اطراف جمع تھے۔ حضرت ممدوح نے قریب ہوتے تحفۂ اسلام پیش کیا اور فرمایا السلام علیکم یا جدی جواب آیا۔ وعلیکم السلام یا ولدی حاضرین نے آوازِ مبارک سماعت کی۔ آپ پر ایک کیفیت طاری ہوئی آپ نے نہایت عقیدت وانکساری کے ساتھ۔ دست اقدس طلب فرمایا۔ اس وقت قبر مبارک شق ہوئی دست معجز نما، مہر پرضیا، جلوہ آرائی انجمن عالم ہوا۔ فوراً حضرت نے دست مبارک کا بوسہ دیکر فوائد ظاہری وباطنی حاصل کیے۔

قوت حافظہ

ایک مرتبہ امام بریلوی نے فرمایا کہ بعض ناواقف حضرات میرے نام کے ساتھ حافظ لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ میں حافظ نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی حافظ صاحب کلام پاک کا رکوع مجھ کو سنا دیں اور پھر دوبارہ مجھ سے سن لیں چنانچہ آپ نے ایک ماہ کی قلیل مدت میں قرآن کریم حفظ فرمالیا۔

بقول مؤلف تذکرۂ نوری "مولانا غلام شبر قادری نوری بدایونی" پھر بڑی خوبی یہ تھی کہ روزانہ ایک پارہ زبانی حفظ کرنے کے باوجود فتاوی ہی مبارکہ لکھنے مسائل شرعیہ واحکام دینیہ کی تعلیم فرماتے اور وقتِ معین پر سند نشینی ہدایت ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین مقدسہ سناتے وغیرہ مشاغل دینیہ میں کسی طرح کا کوئی فرق نہ آنے پاتا۔ آپ صرف تھوڑا سا وقت نماز مغرب کے بعد قرآن پاک حفظ کیا

کرتے تھے"

بقول حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ

اس کو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خداداد قوت حافظہ سے ساڑھے چودہ سو برس (۱۴۵۰) کی کتابیں حفظ تھیں یہ چیز بھی اپنی جگہ پر حیرت ناک ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

تاریخ گوئی

فن تاریخ گوئی کوئی آسان فن نہیں۔ یہ ایک فن ہے جسے سیکھنے کے لئے وقت درکار ہے۔ تاریخی مادہ نکالنے کے لئے وسیع مطالعہ اور مہارت تامہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کی مہارت اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے

حضرت امام بریلوی بے انتہا مصروف زندگی گزارتے تھے لیکن تاریخ گوئی میں آپ کو اتنا کمال اور دخل تھا کہ موقع ومحل کے مطابق بغیر دوات وقلم کے برجستہ تاریخی مادہ ارشاد فرما دیتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کا ارشاد کیا ہوا تاریخی مادہ غلط ثابت ہو۔ آپ کی تصنیفات کتب ورسائل کے نام تاریخی ہیں۔ یہ تاریخیں کتابوں کے مباحث وموضوعات پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات آپ ایک ہی موقع پر دو چار بلکہ دس دس تاریخیں نکال دیتے تھے۔ آپ نے کئی شعراء کے دیوانوں کی تاریخیں بھی نکالیں۔ لوگ اکثر فرمائش کرتے کہ ان کے نومولود بچوں کے تاریخی نام ارسال فرمائیں۔ آپ نے کبھی کسی کو مایوس نہیں فرمایا۔ بعض اوقات ایسے وظائف بھی پڑھنے کو بتا دیتے کہ وظیفے کے اعداد اور وظیفہ خواں کے نام کے اعداد برابر ہوتے جیسے جناب ایوب علی رضوی سے ان کے عرض پر ارشاد ہوا کہ "یا لطیف" کا ورد رکھیں لطیف اور ایوب علی کے اعداد ایک سو انتیس (۱۲۹) ہیں۔

جناب مولانا محمود اسماعیل قادری نقشبندی کی وفات پر آپ نے عربی زبان میں دس تاریخی مادے نثر کے رنگ میں نکالے اور دو تاریخی قطعات سپرد قلم کئے۔ پہلے قطعے میں تیرہ (۱۳) شعر ہیں اور دوسرے میں انتالیس (۳۹) اور ہر مصرع سے موصوف کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ والد گرامی کی زندگی کے حالات پر جو رسالہ جواہر البیان فی اسرار الارکان تصنیف فرمایا ہے۔ اس میں بھی کئی ایسے تاریخی مادے شامل کئے ہیں جن سے تاریخ وفات یا تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ آپ نے اکثر عمارات کے تاریخی مادے نکالے۔ اکثر بزرگوں کی وفات کے تاریخی مادے استخراج کئے۔

ملک العلماء حضرت فاضل بہاری نے بذریعہ خط اپنے نومولود بچے کے تاریخی نام تجویز فرمانے کی درخواست کی تھی۔ فاضل بریلوی نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا۔ نام تو مختار الدین ہونا چاہیئے۔ دیکھئے تو سید صاحب (سید ایوب علی) شاید تاریخ گوئی ہو گئی۔ سید صاحب نے حساب لگایا تو پورے ہوئے اور یہی سن ولادت تھا۔'

لطف بالائے لطف یہ ہے کہ امام بریلوی نے اپنے مکتوبات شریف میں اپنا سن ولادت حسب ذیل آیت کریمہ سے استخراج فرمایا۔

اُولٰئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَہُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ

اس آیت شریف کے عدد بھی ۱۲۷۲ ہوتے ہیں۔ جو موصوف کا سال ولادت ہے۔ آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمایا ہے۔ اور اپنی طرف سے روح القدس کے ذریعے مدد فرمائی ہے"

اس طرح آپ نے اپنی وفات کی تاریخ اس آیت کریمہ سے اخذ فرمائی (وَیُطَافُ عَلَیْہِمْ بِاٰنِیَۃٍ مِّنْ فِضَّۃٍ وَّاَکْوَابٍ)

ترجمہ۔ خدام چاندی کے کٹورے اور گلاس لئے ان کو گھیرے ہیں

اس آیت شریف کا اعداد بھی ۱۳۴۰ ہوتے ہیں جو آپ کا سن وفات ہیں۔

آپ نے اپنی تاریخ وفات وفات سے چار ماہ قبل بھوالی میں خود ارشاد فرمائی تھی۔ اس حقیقت سے جس طرح ایک طرف فن تاریخ گوئی میں آپ کی قوت استخراجیہ کا پتا چلتا ہے تو دوسری طرف آپ کی باطنی نگاہ کمال بصیرت کا سراغ بھی ملتا ہے۔

اسی طرح ریاضی دانی، علم ہیئت، توقیت، علم تکسیر، علم جفر وغیرہ۔ بیشتر علوم وفنون میں بھی امام بریلوی کی قابلیت ومہارت کا

: فتاب پوری طرح چمکتا دمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

تواضع و انکسار۔ اطاعت والدین۔ بزرگوں کی تعظیم چھوٹوں پر شفقت جذبات بخشش و سخاوت۔ احتیاط فی الدین حق گوئی حلم و عفو وغیرہ شعبوں میں بھی آپ کی زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ قطعہ امام بریلوی کی مکمل سوانح عمری ہے اور خود انہی کے قلم سے ہے۔

قطعہ

نہ مرا نوش ز تحسین، نہ مرا نیش ز طعن ـــــ نہ مرا گوش بمدحی نہ مرا ہوش ذمے

منم و کنج خمولی کہ نگنجد در وے ـــــ جز من و چند کتابی و دوات و قلمے

حضرت امام بریلوی کی بعض خصوصی عادتیں

(۱) لفظ محمد کے ساتھ حسن کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضرور فرماتے تھے۔ (۲) سوتے وقت جسم مبارک کو لفظ محمد کی شکل میں کر لیتے تھے۔ (۳) قبلہ کی طرف رخ کر کے کبھی نہ تھوکتے اور قبلہ کی طرف پاؤں نہ کرتے تھے۔ (۴) جماہی لیتے وقت دانتوں میں انگلی دبا کر آواز پیدا نہ ہونے دیتے۔ (۵) کبھی قہقہہ بلند نہ کرتے تھے۔

عادات مبارکہ

(۱) نماز عمامہ باندھ کر پڑھتے (۲) اپنا کنگھا اور شیشہ الگ رکھتے (۳) مسواک ضرور کرتے (۴) سر مبارک میں کھلیل ڈلواتے (۵) تعویذ خدمت خلق کے طور پر مفت دیتے تھے (۶) دکاندار آپ کو مفت سودا دینے کی خواہش کرتے یا کم لینا چاہتے مگر آپ ہمیشہ بازار کی قیمت ادا کرتے تھے (۷) لوگوں کا دل رکھنا بہت ضروری سمجھتے تھے (۸) مسجد سے گھر جاتے ہوئے عمامہ بغل میں دبا لیتے تھے (۹) چلتے وقت بہت آہستہ قدم اٹھاتے اور نگاہیں عام طور پر نیچی رکھتے (۱۰) زیادہ وقت تالیف و تصنیف یا فتاویٰ نویسی میں گزارتے (۱۱) مہمانوں اور عام لوگوں سے ایک وقت عصر کے بعد مستقل ملاقات فرمایا کرتے تھے (۱۲) نماز بہت آہستہ اور سکون سے پڑھتے (۱۳) ہر شخص کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے (۱۴) حیثیت کے مطابق ہر شخص کی تعظیم بھی کرتے (۱۵) سادات کرام کی بڑی عزت اور خاطر و مدارات کرتے (۱۶) کسی کے خلاف شرع کام یا باتیں کرتے ہوئے دیکھتے تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے۔

امام بریلوی کی سبق آموز وصیتیں

(۱) نزع کے عالم میں کارڈ۔ لفافے۔ روپیہ پیسہ۔ تصویر جنب۔ حائضہ اور کتا مکان میں نہ آنے پائیں (۲) سورہ یٰسین اور سورہ رعد سینہ پر دم آنے تک پڑھی جائیں درود شریف بھی متواتر پڑھی جائے۔ رونے والے بچوں کو دور رکھا جائے۔ (۳) قبض روح کے فوراً بعد آنکھیں بند کر دی جائیں۔ اور ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے جائیں بسم اللہ علی ملتہ رسول اللہ کہکر نزع میں ٹھنڈا پانی پلایا جاتے۔ رونا بھی ممنوع قرار دیا (۴) غسل مطابق سنت ہو مولانا حامد رضا خان قادری فتاوی میں تحریر کی ہوئی دعائیں یاد نہ کر سکیں تو مولانا امجد علی نماز جنازہ پڑھائیں (۵) جنازے میں بے وجہ تاخیر نہ کریں جنازے کے آگے آگے ذریعہ قادریہ اور انہی کی نعت تم یہ کروڑوں درود پڑھی جائے (۶) کوئی مدحیہ شعر ہرگز نہ پڑھایا جائے (۷) قبر میں آہستہ اتاریں پیچھے نرم مٹی کا پشتارہ لگائیں۔ داہنی کروٹ پر ذریعہ قادریہ پڑھ کر لٹائیں (۸) اناج قبر پر نہ لے جائیں۔ قبر تیار ہونے تک یہ دعا پڑھیں سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ اللھم ثبت عبدک ھذا بالقول الثابت بجاہ نبیک صلی اللہ علیہ وسلم (۹) بعد تیاری قبر سرہانے کی طرف الم تا مفلحون پڑھی جائے۔ پائنتی کی طرف آمن الرسول تا اخیر پڑھی جائے۔

حامد رضا خان سات مرتبہ اذان دیں تلقین کرنے والے قبر کے مواجہہ میں تین بار تلقین کریں۔ ۱½ گھنٹہ تک قبر پر مواجہہ میں درود شریف بآواز بلند پڑھا جائے اور ممکن ہو سکے تین شبانہ روز تک بآواز بلند قرآن پاک اور درود شریف پڑھوائے جائیں تاکہ اس نئے مکان میں دل لگ جائے (۱۰) کفن خلاف سنت نہ ہو (۱۱) میری فاتحہ کا کھانا صرف غربا کو کھلایا جائے (۱۲) فاتحہ میں طویل وقفہ نہ کیا جائے۔ نیز

مرض ہو تو کوئی حرج نہیں (۱۳) حامد رضا خان ننھے میاں سے صاف رہیں ورنہ میری روح ناراض ہوگی (۱۴) سب بھائی اتفاق سے رہیں۔ اتباع شریعت نہ چھوڑیں اور جس دین پر میں چلا ہوں اس پر چلیں۔

ان مذکورہ قیمتی وصایا میں ہمارے لیے کافی سبق موجود ہیں۔ یہ ہمارے لیے مشعل راہ آخرت ہیں۔

مکتوبات شریف امام بریلوی کے مکتوبات شریف بھی بے شمار حقائق و معارف اور مسائل دینیہ سے بھرپور ہیں۔ آپ کی ظاہری و معنوی خوبیوں کا رنگ بھی ان کے سطر سطر پر چڑھا ہوا ہے۔ شان تجدیدی کا جوہر بھی ان مکتوبات میں چمکتا ہے۔ افراد اہلسنت کے لیے ان میں بھی کافی ہدایات اور سبق موجود ہیں۔ آپ کی تعلیمی سرگرمیوں کی جھلک اور دینی و ملی خدمات کی کرن بھی ہر ہر عبارت پر دمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کلام الامام امام الکلام کا حکیمانہ انداز بھی ہر مکتوب میں پایا جاتا ہے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چاشنی بھی بعض بعض مکتوب میں پائی جاتی ہے۔

یہاں صرف ہم آپ کے دو ایمان افروز مکتوبات گرامی "حیات اعلیٰحضرت" جلد اول مؤلفہ ملک العلماء مولانا ظفر الدین صاحب رضوی سے نقل کرتے ہیں۔ جو بیش قیمت نصائح و عشق رسول کے حامل ہیں۔

(۱) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر دینی و یقینی مولوی عرفان علی سلمہ

بعد ہدیہ سنت مولیٰ عزوجل مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور مدارج عالیہ بخشے اور آپ سب صاحباں کو صبر و اجر عطا کرے اور مدارج عالیہ بخشے اسی کا ہے جو اس نے لیا اور اسی کا ہے جو اس نے دیا اور ہر چیز کی اس کے یہاں ایک عمر مقرر ہے جس میں کمی بیشی نامتصور ہے۔ اور محروم تو وہ ہے جو ثواب سے محروم رہا۔ بے صبری سے جانے والی چیز واپس آنے کی ہرگز نہیں مگر مولیٰ تبارک و تعالیٰ کا ثواب جائے گا وہ ثواب لاکھوں جانوں کی قیمت جانے اعلیٰ ہے تو کیا مقتضائے عقل ہے کہ کوئی چیز ملے بھی نہیں اور ایسی عظیم ملتی ہوئی دولت خود ہاتھ سے کھوئی جائے صابروں کو اجر حساب سے نہ دیا جائے گا۔ بلکہ بے حساب یہاں تک کہ جنہوں نے صبر نہ کیا تھا روز قیامت تمنا کریں گے۔ کاش ان کے گوشت قینچیوں سے کترے جاتے اور یہ ثواب پاتے۔ دوسرے کے جانے کی فکر اس وقت چاہیے کہ خود جانا نہ ہوا ور جب اپنے سر پر جانا رکھا ہے تو فکر اس کی چاہیے کہ جانا اچھی طرح ہو کہ وہاں مسلمان عزیزوں سے نعمت کے گھر میں ایسا ملنا ہو کہ پھر کبھی جدائی نہیں۔ لاحول شریف کی کثرت کیجیے اور ساٹھ بار پڑھ کر پانی پر دم کرکے پی لیا کیجیے۔ آپ بفضلہ تعالیٰ عاقل ہیں۔ اوروں کو ہدایت صبر کیجیے۔ سب کو دعا و سلام۔

فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ ۸ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ "حیات اعلیٰحضرت" صفحہ ۳۱۰

(۲) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت جانم برادر دینی مولوی عرفان علی سلمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ نفی العار کی کاپیاں ہو رہی ہیں بسلامت اللہ لاہل السنۃ غالباً آج چھپ گیا ہوگا۔ ماہ مبارک میں مطبع والے بھی بہت سست کام کرتے ہیں۔ قاضی عطا علی صاحب کا مضمون اب شاید بعد رمضان دیکھا جائے۔ میرا ارادہ ضرور ہے کہ۔

یہ سر ہو اور وہ سنگ در ہو اور یہ سر   رضا وہ بھی اگر چاہیں تو اب دل میں یہ ٹھانی ہے

وقت مرگ قریب ہے۔ اور میرا دل ہند تو ہند مکہ معظمہ میں بھی مرنے کو نہیں چاہتا ہے۔ اپنی خواہش یہی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایمان کے ساتھ موت اور بقیع مبارک میں خیر کے ساتھ دفن ہو۔ اور وہ قادر ہے۔ بہرحال اپنا خیال ہے۔ مگر جائداد کی جدائی یہ لوگ کسی طرح نہ کرنے دیں گے خریدار کو مجھ تک پہنچنے نہ دیں گے کوئی منقول شی نہیں کہ بازار بھیج کر نیلام کر دی جائے۔ اور خالی ہاتھ بھیک پر گزر کرنے کے لیے جانا نہ

شرعاً جائز نہ دل کو گوارا۔ دعا کیجئے کہ بہرات کا انجام بخیر ہو۔ والسلام۔

(فقیر احمد رضا قادری عفی عنہ۔ ۱۰ ماہ رمضان ۱۳۳۳ھ حیات اعلیٰحضرت، صفحہ ۲۱۷)

حضرت امام بریلوی رضی اللہ عنہ اپنے کلام کے آئینے میں

اے خدا بہر جناب مصطفیٰ۔ بہر یار پاک و آل باصفا
بہر جیب پاک عشق امراد۔ بہر خون پاک مردان جہاد
پر کن از مقصد تہی دامان ما
از تو بذرفتن زما کردن دعا

(حدائق بخشش)

ترجمہ:۔ اے مہربان خدا جناب مصطفیٰ کے لیئے، ان کے پاک صحابہ کے لیئے آلِ باصفا کے لیئے اس دامن کا صدقہ جو عشق نامراد سے چاک ہوا۔ اور اس پاک خون کا واسطہ جو مردوں نے میدان جہاد میں بہایا۔
ہماری جھولیاں تہ سعدت سے خالی نہ رکھ۔ ہمارا کام ہے دعا مانگنا تیرا کام ہے قبول کرنا

بیشک قمر ہوں رنگ رخ آفتاب ہوں
ذرہ ترا جو اے شہ گردوں جناب ہوں

بے اصل و بے ثبات ہوں، بحر کرم مدد
پروردہ کنار سراب و حباب ہوں

غور سے سن تو رضا کعبہ سے آتی ہے صدا
میری آنکھوں سے مرے پیارے کا روضہ دیکھو

حشر تک ڈالیں گے ہم پیدائش مولیٰ کی دھوم
مثل فارس نجد کے قلعے گراتے جائیں گے

خاک ہو جائیں عدو جل کر مگر ہم تو رضا
دم میں جب تک دم ہے ذکر انکا سناتے جائینگے

دشمن احمد پہ شدت کیجیے
ملحدوں کی کیا مروت کیجیے

ذکر ان کا چھیڑیے ہر بات میں
چھیڑنا شیطان کا عادت کیجیے

شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب
اس برے مذہب پہ لعنت کیجیے

بکار خویش حیرانم اغثنی یا رسول اللہ
پریشانم پریشانم اغثنی یا رسول اللہ

ندارم جز تو ملجائے ندانم جز تو ماوائے
تو ئی خود ساز و سامانم اغثنی یا رسول اللہ

شہا بیکس نوازی کن طبیبا چارہ سازی کن
مریض درد عصیانم اغثنی یا رسول اللہ

(حدائق بخشش)

کیا فقط کلمہ گوئی مسلمان کیلئے کافی ہے؟

آدمی فقط زبان سے کلمہ پڑھنے یا اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے مسلمان نہیں ہوتا جب کہ اس کا قول یا فعل اس کے دعوے کا کذب ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے، کلمہ پڑھے۔ بلکہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ادا کرے۔ بایں ہمہ خدا اور رسول کی باتیں جھٹلائے یا خدا اور رسول و قرآن کی جناب میں گستاخیاں کرے یا زنار باندھے۔ بت کے لیئے سجدے میں گرے تو وہ مسلمان قرار پا سکتا یا عادت کے طور پر وہ کلمہ پڑھنا اس کے کام آسکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

(الکوکبۃ الشہابیہ صفحہ)

مسئلہ علم غیب

(۱) علم ذاتی اللہ عزوجل سے خاص ہے اس کے غیر کے لیئے محال ہے۔ جو اس میں سے کوئی چیز اگرچہ ایک ذرہ سے کمتر سے کمتر غیر خدا کے لیئے مانے۔ وہ یقیناً کافر و مشرک ہے۔ (۲) اگر تمام اہل عالم، اگلے پچھلوں، سب کے جملہ علوم جمع کیئے جائیں تو ان کو علوم الٰہیہ سے وہ نسبت نہ ہوگی۔ جو ایک بوند کے دس لاکھ حصوں سے ایک حصّے کو۔ دس لاکھ سمندروں سے۔ (۳) ہم نہ

علم الٰہی سے مساوات مانیں۔ نہ غیر کے لئے علم بالذات جانیں اور عطائے الٰہی سے بھی بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں، نہ کہ جمیع" (۴۴) اجماع ہے۔ کہ اس فضل جلیل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حصہ تمام انبیاء تمام جہاں سے اتم و اعظم ہے۔ اللہ عز و جل کی عطا سے حبیب اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اتنے غیبوں کا علم ہے جن کا شمار اللہ ہی جانتا ہے (خالص الاعتقاد ص۲۴، ۲۵)

سب کو کافر کہدیا؛

عوام مسلمین کو بھڑکانے، اور دن دہاڑے اُن پر اندھیری ڈالنے کو یہ چال چلتے ہیں کہ علمائے اہلسنت کے فتویٰ تکفیر کا کیا اعتبار۔ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر کافر کہدیتے ہیں ان کی مشین میں ہمیشہ کفر ہی کے فتوی چھپا کرتے ہیں۔ اسمعیل دہلوی کو کافر کہدیا۔ مولوی اسحاق صاحب کو کافر کہدیا۔ مولوی عبدالحق صاحب کو کہدیا۔ پھر جنکی حیا اور بڑھی ہوئی ہے وہ اتنا اور بڑھاتے ہیں کہ معاذ اللہ حضرت شاہ عبدالعزیز کو کہدیا۔ پھر مولانا شاہ فضل الرحمٰن (گنج مراد آبادی قدس سرہ العزیز) کو کہدیا۔ یا پھر جو پورے ہی حد حیا سے اوپر گزر گئے۔ وہ یہاں تک بڑھتے ہیں۔ عیاذاً باللہ عیاذ باللہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو کہدیا۔ یہاں تک کہ انہیں سے بعض کے بزرگواروں نے مولانا مولوی شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی مرحوم و مغفور سے جاکر جڑ دی کہ معاذ اللہ، معاذ اللہ، معاذ اللہ حضرت سیدنا شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ کو کافر کہہ دیا۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ جنت عالیہ عطا فرمائے۔ انہوں نے آیت کریمہ۔ اِن جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا۔ پر عمل فرمایا۔ خط لکھکر دریافت کیا جس سے یہاں سے رسالہ "انجاس البری عن وسواس المفتری" لکھا، ارسال ہوا اور مولانا نے مفتری کذاب پر لاحول شریف کا تازیانہ بھیجا۔ غرض ہم پر ایسے ہی افترا و بہتان کرتے ہیں...... (حسام الحرمین ص۲۲)

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

دل میں کیا، برملا فحش گالیاں دیتے ہیں، بعض تو مغلظات سے بھرے ہوئے بیرنگ خطوط بھیجتے ہیں پھر ایک نہیں اللہ اعلم کتنے آتے ہیں مجھے اس کی پروا: نہیں اس سے میری ذات پر حملہ کریں، تو میں شکر کرتا ہوں کہ اللہ عز و جل نے مجھے دین حق کیلئے سپر بنایا کہ جتنی دیر وہ مجھے کوستے گالیاں دیتے برا بھلا کہتے ہیں۔ اتنی دیر اللہ و رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین و تنقیص سے باز رہتے ہیں۔ ادھر سے کبھی اس جواب کا وہم بھی نہیں اور نہ کچھ برا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری عزت ان کی عزت پر نثار ہونے ہی کے لئے ہے۔ بلکہ ان پر نثار ہونا ہی عزت ہے.....

(الملفوظ ج ۲ ص۵)

حرفِ آخر

بالآخر بندہ راقم الحروف اعلیحضرت امام اہلسنت مجدد دین و ملت حضرت امام احمد رضا بریلوی قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ بیکس پناہ میں حضرت مولانا معین الدین نزہت والد محترم حضرت صدر الافاضل علیہ الرحمۃ کے ہمنوا ہو کر خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔

رضائے احمد اسی میں سمجھوں ۔۔۔ کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

ایک عظیم مسلمان سائنسدان

امام احمد رضا خاں

سید محمد ریاست علی قادری بریلوی

ادارۂ معارف رضا کے روح رواں سید ریاست علی صاحب قادری بنیادی طور پر انجنیئر ہیں، برسہا برس جرمنی میں گزارے لیکن یہ فاضل بریلوی قدس سرہ کی کرامت ہے کہ آپ کا دینی ذوق وہاں بھی برقرار رہا اور اب یوماً بیوماً اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ روزنامہ جنگ میں موصوف کے مضامین وقتاً فوقتاً طبع ہوتے رہتے ہیں۔ سید صاحب فاضل بریلوی کے صاحبزادہ گرانقدر مفتی اعظم ہند کے خلیفہ مجاز و ماذون ہیں۔ سید صاحب نے اس سے قبل فاضل بریلوی کا رسالہ لوگارثم ہدیہ ناظرین کیا ہے اس کے علاوہ ایک کتاب مفتی اعظم ہند بھی ترتیب دی ہے۔ زیر نظر مقالہ بھی سید صاحب نے منفرد انداز میں تحریر فرمایا ہے جسکے لئے اراکین ادارہ ان کے شکر گزار ہیں۔

علم و سائنس پر مسلمانوں نے جو احسانات کئے ہیں اور جس طرح شمع علم کو روشن رکھنے کی کوشش کی ہے اس کا اندازہ علم و سائنس کی ان بے شمار کتب سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ورثہ میں چھوڑی ہیں۔ علوم و فنون کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں مسلمان عالموں اور سائنسدانوں نے کوئی نہ کوئی یادگار تصنیف نہ چھوڑی ہو۔ سائنسی علوم پر تو مسلمان عالموں اور سائنسدانوں کی شہرہ آفاق تصانیف خصوصیت کیساتھ آج بھی یورپ اور مغربی ممالک میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ریاضی ہو یا ہیئت، طب ہو یا قانون، طبقات الارض ہو طبیعات، منطق ہو یا فلسفہ، کیمیا ہو یا نجوم، فلکیات ہو یا ارضیات غرض وہ کون سا ایسا علم و فن ہے جس میں مسلمان سائنسدانوں نے تحقیق نہ کی ہو اور ریسرچ کی نئی راہیں نہ کھول دی ہوں موجودہ دور کی سائنسی ترقی اور ایجادات مسلمان سائنسدانوں اور موجدوں کی علمی و تحقیقی کاوشوں کی مرہون منت تھی۔ ابن الہیثم نے بصارت اور علم المناظر کے میدان میں اپنے پیشرو اور ہمسر سائنسدانوں کے نظریات کو باطل قرار دیکر بصارت اور روشنی کے ٹھوس اور مثبت دلائل پیش کر کے نہ صرف دنیا میں تہلکہ مچا دیا بلکہ وہ کچھ دیا جس سے آج پوری عالمی برادری فیضیاب ہو رہی ہے۔ ابن الہیثم کا ان عالموں میں شمار ہوتا ہے جو فلسفے کے ساتھ ساتھ ہیئت ریاضی اور طب کے ماہر بھی تھے۔ ابن الہیثم کی تحقیقات کا دائرہ زیادہ تر "روشنی اور شعاعوں" پر محیط ہے۔ حیرت

ہے کہ اس نے روشنی کی ماہیت، انعکاس نور اور انعطاف نور کے متعلق دسویں، گیارہویں صدی میں جو تصورات پیش کئے تھے اور جو کلیات وضع کئے تھے۔ وہ آج بھی درست ہیں۔ جابر بن حیان وہ پہلا کیمیا دان تھا جس نے مادے کو ارسطو کے عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے طلسم سے نکالا اور اسے گرمی، سردی، خشکی اور نمی کی صفات سے متصف کرکے جوہری نظریئے کو جدید بنیادوں پر استوار کیا۔ سولہویں صدی عیسوی کے یورپی کیمیا دان جابر بن حیان کی تعلیمات سے اتنا متاثر ہوئے کہ برسٹل کا نامور انگریز کیمیا دان ٹامس مارٹن اپنے آپ کو جابر کا باورچی کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ الخوارزمی صرف اسلامی دنیا کا ہی نہیں بلکہ مغربی دنیا کا بھی ریاضی دان تھا ہئیت اور حساب میں اپنے وقت کا امام تسلیم کیا جاتا تھا۔ کیپلر اور کاپرنیکس نے الخوارزمی ہی کی معلومات پر اپنی تحقیق اور تجربوں کو آگے بڑھایا۔ طب کے میدان میں الطبری نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دنیائے طب ہمیشہ اس کی احسان مند رہے گی۔ بوعلی سینا سے کون واقف نہیں جس نے "القانون فی الطب" لکھ کر دنیائے طب پر عظیم احسان کیا۔ اس کی یہ تصنیف دنیائے طب یعنی میڈیکل سائنس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ الفرغانی جیسا مایہ ناز انجینئر اور ماہر فلکیات جس نے زمین کا قطر معلوم کرنے کے لئے رصدگاہ تعمیر کرائی اور آنے والے محققین کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ امام رازی ایک زبردست ماہر طب تھا جو بابائے طب (بابائے میڈیسن) کہلایا۔ وہ مشرق کی نسبت مغرب میں زیادہ مشہور ہوا۔ الفارابی نے موسیقی کو سائنسی بنیادوں پر استوار کرکے موسیقی اور سازوں کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ الزہراوی اسلامی دنیا کا عظیم ترین سرجن تھا جس کی کتابیں سترھویں صدی عیسوی تک سرجری کے نصاب میں پڑھائی جاتی تھیں۔ طبقات الارض کا عظیم اور نامی گرامی ماہر۔ البیرونی وہ پہلا سائنسدان تھا جس نے یہ کہا کہ دریائے سندھ کی وادی کسی قدیم سمندر کا ایسا طاس ہے جو رفتہ رفتہ مٹی سے بھر گیا۔ آج بیشتر طبقات الارض کے ماہرین جدید آلات اور سہولتوں کے حصول کے بعد البیرونی کے اس نظریئے کی تائید میں ثابت کرتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے ریگستان کسی زمانے میں سمندر کے طاس تھے۔ عمر خیام کی کتاب "الجبر و مقابلہ" ساری دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم اس عظیم سائنسدان کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ امام غزالی جن کو سائنسدانوں کا امام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ امام غزالی کے آگے ارسطو اور افلاطون طفل مکتب نظر آتے ہیں۔ امام غزالی نے یونانی فلسفے کی دھجیاں اڑا کر اسلامی فلسفے کی بنیاد رکھی۔ ابن رشد کو دیکھئے کہ وہ نہ صرف مشرقی دنیا بلکہ مغربی دنیا کا بھی حکیم کہلایا۔ فلسفے کا جو تعلق مذہب سے ہے اس کی جھلک ابن رشد کے ان فتوؤں میں بخوبی نظر آتی ہے جو اس نے قرطبہ کے قاضی کی حیثیت سے صادر کئے تھے۔

چودھویں صدی کے نصف میں ہندوستان میں بھی ایک ایسا عظیم الشان سائنسدان پیدا ہوا جس کو لوگ فقیہہ اعظم، امام وقت، چودھویں صدی کا مجدد اور مختلف القابوں سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علوم و فنون کا ہمالہ تھا۔ وہ علم کا ایک ایسا بحر بیکراں تھا جس میں علوم و فنون کے لاتعداد دریا گرتے ہوں۔ جس کو علوم جدیدہ و قدیم پر اس طرح مہارت ہو گویا وہ سب اس کے سامنے کھلونوں کی طرح بکھرے ہوں۔ وہ بیشتر علوم پر

اس طرح حاوی تھا جیسے وہ ان سب کا ماخذ ہی موجد ہو۔ میرا اشارہ اعلیٰ حضرت امام شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کی طرف ہے بلا شبہ علم و فن میں ان کے معاصرین میں ان کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ کثرت علوم پر ان کو جو عبور حاصل تھا اس کی نظیر ان کے عہد میں تو کیا ماضی میں بھی شاذ ہی نظر آتی ہے۔ امام احمد رضاؒ کی شخصیت میں بیک وقت کئی سائنسدان گم تھے۔ ایک طرف ان میں ابوالہیثم جیسی فکری بصارت اور علمی روشنی تھی تو دوسری طرف جابر بن حیان جیسی صلاحیت، الخوارزمی اور یعقوب کندی جیسی کہنہ مشقی تھی تو دوسری طرف البطری۔ الفرغانی، رازی اور بوعلی سینا جیسی دانشمندی، فارابی، البیرونی، عمر بن خیام، امام غزالی اور ابن رشد جیسی خداداد ذہانت تھی تو دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ کے فیض سے فقیہانہ وسیع النظری اور غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے روحانی وابستگی اور لگاؤ کے تحت عالی ظرفی۔ امام احمد رضا کا ہر رُخ ایک مستقل علم و فن کا منبع تھا۔ ان کی ذات میں کتنے ہی علم و عالم گم تھے، وہ ایک ہمہ گیر و ہمہ صفت انسان تھے۔ انہوں نے تقریباً ایک ہزار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں فتاویٰ رضویہ جو بارہ ہزار صفحات پر محیط ہے۔ یہ مجموعہ آپ کی جودت طبع اور تبحر علمی کا منہ بولتا شاہکار اور ایسا انمول خزانہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ کوئی علم و فن ایسا نہیں جس کی جھلک آپ کو اس مجموعہ روزگار تصنیف میں نہ ملے۔ علم، قرآن، علم حدیث اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، کتب فقہ جملہ مذاہب، جدل مہذب، تفسیر، علم العقائد، علم الکلام، نحو، صرف، معانی، بیان بدیع، مناظرہ، تجوید، تصوف، سلوک، اخلاق، اسماء الرجال سیر، تاریخ، لغت، ادب وغیرہ کے علاوہ امام احمد رضاؒ کو سائنسی علوم پر بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ ارثماطیقی، جبر و مقابلہ حساب سینی، لوغارثمات، توقیت، زیجات، مثلث کروی، مثلث مسطح، ہیاۃ جدیدہ، مربعات، جفر، زائرچہ، حساب، ہیئت، ہندسہ، تکسیر، نجوم جیسے علوم میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے صرف یہی نہیں کہ آپ اس قدر علم و فنون پر مہارت رکھتے تھے یا ان سے آشنا تھے بلکہ ہر فن میں آپ نے کوئی نہ کوئی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مشہور و معروف کتب پر حواشی تحریر فرمائے۔ آپ کی مختصر سے مختصر تحریر بھی گنجینۂ علم و عرفان ہے۔ آپ کا ہر فتویٰ ایک تحقیق کا حکم رکھتا ہے مثال کے طور پر صرف ایک فتویٰ جو ۵۰ صفحات پر محیط ہوا ہے اس میں ۱۳۰ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس دور میں جبکہ تحقیق کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار قائم ہو چکے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح کتاب النکاح میں جو مقدمہ آپ نے لکھا ہے اس میں ۹۰ کتب کے نام حوالے کے طور پر پیش کئے ہیں۔ موصوف نے اس خطبۂ افتتاحیہ میں علوم کے ایسے دریا بہائے ہیں کہ گزشتہ صدی گزر جانے کے بعد سے آج تک کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی۔ اس خطبہ میں ۹۰ کتب کے نام نثر میں اس طرح پروئے ہیں جو عربی ادب کا شاہکار ہیں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ جب عربی عبارت کا ترجمہ کیا جائے تو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ خطبہ عربی کتابوں کے ناموں سے ترتیب دیا گیا ہے اور ایک خصوصیت اور التزام یہ بھی ہے کہ صرف ان ہی کتب کے نام درج کئے ہیں جو فتاویٰ کے جواب در حوالہ جات کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امام احمد رضاؒ کو غضب کا حافظہ عطا فرمایا تھا جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی جلد چہارم میں جنازے سے

متعلق ایک فتویٰ تحریر ہے جس میں آپ نے ۲۰ کتب کے حوالے
پیش کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ نماز جنازہ کی تکرار ناجائز ہے (ملاحظہ
ہو" رسالہ النہی الحاجز عن تکرار صلاۃ الجنائز")

حقیقت میں امام احمد رضاؒ ان تمام علوم و فنون سے پوری
طرح واقف تھے جو ایک فقیہہ کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ آپ
کے پاس دنیا بھر سے سینکڑوں سوالات آتے تھے جس کا جواب
آپ اس انداز سے دیتے تھے کہ حیرت ہوتی۔ فارسی میں سوال آتا تو جواب بھی
فارسی میں دیتے۔ سوال انگریزی میں آتا تو اس کا جواب بھی عربی
میں دیا جاتا۔ سوالات منظوم شکل میں ہوتے تو جواب بھی منظوم
ہی ہوتا جیسا کہ میں نے ماسبق سطور میں کہا ہے کہ امام احمد
رضاؒ کو اصناف علم میں ہر صنف پر کامل عبور تھا اور سائنسی
علوم پر تو اس قدر مہارت حاصل تھی کہ میتھیمیٹکس کی بیشتر شاخوں
مثلاً الجبرا، جیومیٹری، ٹرگنامیٹری اور لوگارثم وغیرہ کی مدد سے
بڑے سے بڑا مسئلہ حل فرما دیا کرتے تھے اور اپنے نظریہ
اور جواب کی وضاحت میں صفحات کے صفحات پیش کرتے۔ یہ
کام وہی کر سکتا ہے جس کو ریاضی اور سائنسی علوم پر پورا پورا
عبور اور مہارت حاصل ہو۔ جوابات دیتے وقت آپ نہ صرف
اپنے دلائل پر ہی اکتفا فرماتے بلکہ مخالفین کے دلائل پر بھی
بخوبی مطلع ہوتے اور ان کے ممکنہ اعتراضات کے شافی
جواب شامل کر لیتے تھے۔ حق یہ ہے کہ جب تک جواب دینے
والا مخالف کے دلائل پر عبور نہ رکھتا ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ
وہ کوئی حتمی فیصلہ کر سکے۔ علیگڑھ سے کسی صاحب نے
۱۳۲۴ھ میں ایک فتویٰ بھیجا جس میں تحریر تھا " کچھ نئی
روشنی والوں نے اپنے قیاسات اور انگریزی آلات کی مدد
سے یہ تحقیق کیا ہے کہ وہاں مسجد کی سمت قبلہ سے منحرف
ہے وغیرہ وغیرہ " اس کے جواب میں امام احمد رضاؒ نے
پورا ایک رسالہ " ہدایۃ المتعال فی حد الاستقبال " تحریر فرمایا
(فتاویٰ رضویہ جلد سوم صفحہ ۱۵ تا ۱۴۱) امام احمد رضاؒ نے قرآن
حکیم اور احادیث شریف کے سوالوں سے اسکا رد فرمایا نیز
ریاضی کے مختلف علوم کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ سوال غلط
ہے (تفصیل کیلئے مندرجہ بالا رسالہ ملاحظہ کیجئے)

اثبات جزو لا یتجزیٰ کے متعلق امام احمد رضا خان ؒ
نے قرآن کریم سے اثبات جزو کی دلیل مستنبط کی۔ فرماتے
ہیں " میں نے تو جزو لا یتجزیٰ کا قرآن عظیم سے
اثبات کیا " اور یہ آیت پیش کی وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ
(ترجمہ: "اور ہم نے ان کو پارہ پارہ کر دیا")

امام احمد رضاؒ نے ایک امریکن ہیئت داں پروفیسر البرٹ
کی پیش گوئی کے رد میں ۱۷ دلائل پیش کئے اور اس کی
باطل پیشگوئی کے پرخچے اڑا دیئے (دیکھئے معین مبین
بہر دور شمس و سکون زمین) حرکت زمین کے متعلق رسالہ
(فوز مبین) لکھا جو سائنسدانوں کے لئے ایک چیلنج ہے اس
کے علاوہ " نزول آیات قرآن بسکون زمین و آسمان "
تحریر فرمایا۔

کتاب الطہارۃ فتاویٰ رضویہ میں آپ سے ایک
مسئلہ پوچھا گیا۔ " کنوئیں کا دور کتنے ہاتھ ہونا چاہئے
کہ وہ دہ در دہ ہو اور نجاست گرنے سے ناپاک نہ ہو سکے"۔ امام
احمد رضاؒ نے لوگارثم کی مدد سے اس مسئلہ کا اتنا مدلل
جواب دیا کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے علم ریاضی کی اعلیٰ
نصاب کی طرف توجہ فرمائی اور اس کی مدد سے جدول تیار
کیا جو دائرے کے قطر، محیط و مساحت کے درمیانی رشتہ

کو بتانے کے لیے اپنی مثال آپ ہے۔ اس نقشہ کا انگریزی ترجمہ پیش خدمت ہے۔

KNOWN QUANTITY	UNKNOWN QUANTITY		
	LOG D	LOG C	LOG A
LOG D	-	$\log D + 0.4971499$	$2\log D + \bar{1}.8950899$
LOG C	$\log C + \bar{1}.5028501$	-	$2\log C + \bar{2}.9007901$
LOG A	$\dfrac{\log A + 0.1049101}{2}$	$\dfrac{\log A + 1.0992099}{2}$	

HERE D = DIAMETER OF THE CIRCLE
C = CIRCUMFERENCE OF THE CIRCLE
A = AREA OF THE CIRCLE

اس مسئلہ میں امام احمد رضا نے کتب فقہ کے چار اقوال پیش کئے ہیں۔

قول نمبر ۱ ________ ۴۸ ہاتھ

قول نمبر ۲ ________ ۴۶ ہاتھ

قول نمبر ۳ ________ ۴۴ ہاتھ

قول نمبر ۴ ________ ۳۶ ہاتھ

قول نمبر ۴ کو آپ نے نہ صرف درست بتایا جہاں اصل میں ۳۵.۴۴۹ ہاتھ ہے اور جس میں آدھے ہاتھ سے زیادہ کا فرق ہے بلکہ کنواں مذکور کے صحیح دور کی دریافت یعنی ۳۵.۴۴۹ کے لئے آپ نے علم الحساب کی کس باریکی کا مصرف لیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کے ان کیلکولیشن سے ہی لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے پیش کئے ہیں اور جس کو ایک ماہر علم ریاضی و ہندسہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

کتاب تیمم کے باب میں آپ نے جنس ارضی اور آگ کا تذکرہ کیا ہے جس میں ۱۸۰ ایسی چیزوں کے نام گنوائے ہیں جن میں تیمم کیا جاسکتا ہے اور پھر ۱۳۰ چیزوں کے نام جن پر تیمم جائز نہیں۔ اسی جگہ آپ نے تقریباً ۸۰ ایسے پتھروں کی اقسام بھی بتائی ہیں جن سے تیمم ہوسکتا ہے۔ پتھروں کی جائے پیدائش، وقوع اور ماہیئت پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے علم کیمیا اور ماہر ارضیات و معدنیات اگر اس کی روشنی میں مزید تحقیق کریں تو یہ ایک عظیم کام ہوگا جس پر آنے والی نسلیں فخر کرسکیں گی۔

گندھک اور پارہ کے متعلق بھی امام احمد رضا نے لکھا ہے کہ گندھک نر ہے اور پارہ مادہ اور کان کی ہر جگہ ان

دونوں کے میل و نکاح سے اولاد ہے۔ یہ چیز کیمیا کے محققین کے لئے دعوت فکر ہے۔

علم فلکیات کے متعلق امام احمد رضا کا فتویٰ جس میں ایک صاحب نے دریافت کیا تھا "رمضان شریف کی رات کے ساتویں حصے کے باقی رہنے پر کھانا پینا چاہیئے کہ نہیں" تو اس کے جواب میں امام احمد رضا نے اپنے تجرباتی مشاہدوں اور فلکیاتی مطالعوں کی بنیاد پر فرمایا کہ مذکورہ عام طریقہ غلط اور بے بنیاد ہے کبھی رات کا ہنوز چھٹا حصہ باقی رہتا ہے کہ صبح ہو جاتی ہے اور کبھی ساتوں، آٹھواں، نواں یہاں تک کہ کبھی دسواں حصہ باقی رہتا ہے کہ صبح ہو جاتی ہے۔ آپ نے بریلی اور اس کے موافق العرض شہروں کے لئے رأس اور بروج کا ایک ایسا نقشہ مرتب کیا جو تا ابد ان مضافات کے رات اور صبح کی نسبت نشان دہی کرتا رہے گا۔

نقشہ مذکور درج ذیل ہے

تاریخ شمسی	راس برج	[illegible]	شب عرفی	مقدار صبح	مقدار شب شرعی	شب شرعی کے منٹ	صبح کے منٹ	شب شرعی و صبح کی نسبت	تخمینی نسبت
		گھنٹہ منٹ	گھنٹہ منٹ	گھنٹہ منٹ	گھنٹہ منٹ				
۲۰/مارچ	حمل	۱۲ ۰	۱۱ — ۴۵	۱ — ۲۰	۱۰ — ۴۴	۶۴۴	۸۰	۸۰/۶۴۴	نواں حصہ
۲۲/اپریل	ثور	۱۱ ۱۰	۱۱ — ۵۱	۱ — ۲۴	۹ — ۰۴	۹۶۴	۸۴	۲/۱۶۶	آٹھواں حصہ
۲۲/مئی	جوزا	۱۰ ۲۸	۱۰ — ۲۲	۱ — ۳۱	۸ — ۵۱	۹۲۲	۹۱	۹۱/۹۲۲	ساتواں حصہ
۲۲/جون	سرطان	۱۰ ۱۲	۱۰ — ۶	۱ — ۳۶	۸ — ۳۰	۶۰۶	۹۶	۱/۱۰	چھٹا حصہ قدرے کم
۲۲/جولائی	اسد	۱۰ ۲۸	۱۰ — ۲۲	۱ — ۳۱	۸ — ۵۱	۹۲۲	۹۱	۹۱/۹۲۲	ساتواں حصہ
۲۲/اگست	سنبلہ	۱۱ ۱۰	۱۱ — ۵۲	۱ — ۲۳	۹ — ۲۹	۹۶۲	۸۳	۸۳/۹۶۲	آٹھواں حصہ
۲۲/ستمبر	میزان	۱۲ ۰	۱۱ — ۵۰	۱ — ۱۹	۱۰ — ۳۲	۷۱۲	۷۹	۷۹/۷۱۲	نواں حصہ
۲۲/اکتوبر	عقرب	۱۲ ۵۰	۱۲ — ۲۲	۱ — ۱۹	۱۱ — ۲۳	۷۶۲	۷۹	۷۹/۷۶۲	نواں حصے سے قدرے کم
۲۲/نومبر	قوس	۱۳ ۲۵	۱۳ — ۲۲	۱ — ۲۲	۱۲ —	۸۰۲	۸۲	۸۲/۸۰۱	دسواں حصہ
۲۲/دسمبر	جدی	۱۳ ۴۸	۱۳ — ۴۰	۱ — ۲۵	۱۲ — ۱۵	۸۰۲	۸۵	۱/۱۴۴	دسواں حصہ
۲۲/جنوری	دلو	۱۳ ۲۳	۱ — ۲۲	۱ — ۲۲	۱۲ — ۰	۸۰۲	۸۲	۸۲/۸۰۱	دسواں حصہ
۲۱/فروری	حوت	۱۲ ۵۰	۱۲ — ۴۲	۱ — ۱۹	۱۱ — ۲۳	۷۶۲	۷۹	۷۹/۷۶۲	نواں حصہ قدرے کم

علم نجوم یا علم توقیت سے تعلق رکھنے والے قارئین ہی اب بتائیں کہ شہر مذکور کے لئے اتنا واضح چارٹ مرتب کرنیوالے شخص کو ہم ماہر علم نجوم یا علم توقیت کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کے علاوہ وقت سحر و صبح صادق و صبح کاذب کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ امام احمد رضا نے اس مسئلہ میں فرمایا کہ عرض البلد پر منحصر ہے کہ صبح رات کا کون سا حصہ ہے لیکن تمام جگہوں کے لئے مندرجہ

ذیل مشاہدہ ہے جو نقشے کے ساتھ ذیل میں درج ہے۔

(۱) افق سے کچھ نیزے بلندی پر جانب مشرق آج جہاں سے آفتاب نکلنے کو ہو اس کی سیدھ میں یعنی دائرہ منطقۃ البروج کی سطح میں کرہ بخار پر رات کی تاریکی میں ایک خفیف سپیدی کا دھبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو صبح کاذب کی بنیاد ہے۔

پھر یوں — پھر یوں ہوتی ہے — پھر شکل یوں ہوتی ہے

(۴) (۳) (۲) (۱)
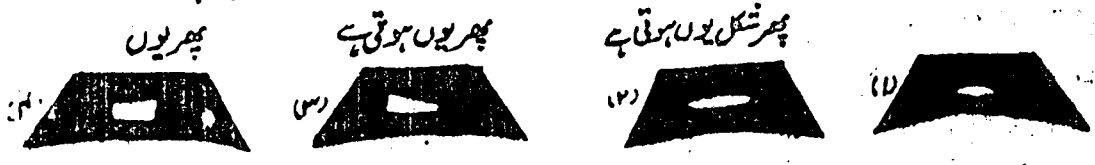
اس کے بعد ہی دونوں پہلو سپید ہو جاتے ہیں اور شمالاً و جنوباً اس کا عرض بہت خفیف ہوتا ہے۔ بعض نے اس وقت کو صبح قرار دیا ہے اور یہی احوط ہے اور بعض نے اسے بھی کاذب میں رکھا ہے اور یہی اوسع ہے۔

(۶) (۵)
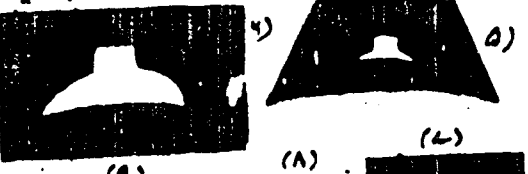
پھر آناً فآناً جنوباً اور شمالاً پہلوؤں کی سپیدی پھیلنا شروع کرتی ہے اور خفیف دیر میں پھیل جاتی ہے۔ یہ یقینی اجماعی صبح صادق ہے یہاں سپیدی دلالۃ عموماً ہنوز باقی ہے۔ مگر یہ بھی سپیدی جیسے جیسے جنوب و شمال میں پھیلتی ہے ساتھ ہی نیچے سے اوپر چڑھتی جاتی ہے اور وہ عمود سپید رفتہ رفتہ اس منتشر سپیدی میں گم ہوتے ہوتے فنا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر نقشہ ۷، ۸، ۹ سے ظاہر ہے۔

(۹) (۸) (۷)

اب یہ سپیدی جس طرح آسمان پر چڑھتی زمین کی جانب بھی متوجہ ہوتی ہے اور صحن، و بام کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ وقت اسفار کا ہے کہ نماز صبح کا مستحب وقت ہے اور اس سے پہلے اندھیرے میں پڑھنی خلاف مستحب۔ اسی طرح رویت ہلال کے سلسلے میں آپ نے LOGRITHMIE CALCULATION سے زمین کے ایک درجہ کی قدر ۶۹٫۰۵۴ میل نکالا اور پھر طویل تشریح کے بعد مسئلہ رویت ہلال کو بالکل صاف اور واضح کر دیا۔

ان کے علاوہ امام احمد رضا نے مختلف فتاویٰ میں جن مسائل پر تحقیق کی ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ پانی میں رنگ ہے یا نہیں؟

۲۔ پانی کا رنگ سپید ہے یا سیاہ؟

۳۔ موتی، شیشہ۔ بلور پیسنے سے خوب سپید کیوں ہو جاتے ہیں؟

۴۔ آئینہ میں دار پڑ جائے تو وہاں سپیدی کیوں معلوم ہوتی ہے؟

۵۔ پانی میں مسام ہیں یا نہیں؟

۶۔ آئینہ میں اپنی صورت کے علاوہ چیزیں جو پیچھے کے پیچھے ہیں کس طرح نظر آتی ہیں

۷۔ شعاع کی جنس

۸۔ رنگتیں تاریکی میں موجود رہتی ہیں

۹۔ کان کی ہر چیز گندھک، پارے سے متولد ہے

۱۰۔ گندھک نر ہے اور پارہ مادہ

۱۱۔ شعاعیں جتنے زاویوں پر جاتی ہیں۔ اتنے پر ہی پلٹتی ہیں۔

امام احمد رضا کے یہاں ہمیں ایک عجوبہ و نادر چیز جو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ مسئلہ خواہ کسی موضوع کا ہو، روحانی

ہو یا مادی، نفسیاتی ہو یا سائنسی، علمی ہو یا مذہبی ہر جگہ مکمل وضاحت نظر آتی ہے اور تحریر میں وضاحت اسی وقت ہوگی اور تحریر کرنے والا موضوع پر پورا عبور رکھتا ہو اور موضوع اس کی مکمل گرفت میں ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے امام احمد رضاؒ کو جس طرح نوازا۔ ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کیلئے آپ کی شخصیت اور علمی استعداد قابل فخر ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ برصغیر (ہند و پاک) کے رہنے والوں نے اس شخصیت کو پہچانا نہیں۔ ورنہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ یورپ، امریکہ والوں نے اپنے عالموں کی کسطرح قدردانی کی۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اپنے لوگوں کے کارناموں کو تحت الثریٰ سے ثریا تک پہنچایا جائے۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے قابل فخر کارناموں کو اجاگر کریں اور دنیا کو یہ بتائیں کہ ہم تہی دامن نہیں ہیں۔ ہمارے اسلاف نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

پیشہ میرا شاعری نہ دعویٰ مجھ کو
ہاں شرع کا البتہ ہے جنبہ مجھ کو
مولیٰ کی ثناء میں حکم مولیٰ کا خلاف
لوزینہ میں سیر تو نہ بھایا مجھ کو
ہوں اپنے کلام سے نہایت محفوظ
بیجا سے ہے المنۃ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل دیئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں
جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ ان کی آنکھیں
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں
اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مُردے جلا دیئے ہیں
ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آگئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں
ہم سے فقیر بھی اب پھیری کو اُٹھتے ہوں گے
اب تو غنی کے در پر بستر جما دیئے ہیں
اس راہ میں گرے جس دم بیڑے پہ قدسیوں کے
ہونے لگی سلامی پرچم جھکا دیئے ہیں
آنے دو یا ڈبو دو اب تو تمہاری جانب
کشتی تمہیں پہ چھوڑی لنگر اٹھا دیئے ہیں
دولہا سے اتنا کہہ دو پیارے سواری روکو
مشکل میں ہیں براتی پرخار بادیئے ہیں
اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہوگا
رو رو کے مصطفےٰ نے دریا بہا دیئے ہیں
میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں دُر بے بہا دیئے ہیں
مُلکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار
اعداء سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

امام احمد رضا کا ایک نادر فتویٰ

پیشکش: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد

مولانا محمد احمد مصباحی (پرنسپل مدرسہ عربیہ فیض العلوم، محمد آباد گوہنہ اعظم گڑھ، بھارت) کی عنایت سے امام احمد رضا کا ایک نادر انگریزی فتویٰ ملا جس میں متولی اور وقف بورڈ کے اختیارات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ فتویٰ ۸ مئی ۱۹۰۸ء کو رنگون (برما) کے ایک مفتی محمد قادر علی کے استفتاء (مرسلہ ۱۹ مئی ۱۹۰۸ء) کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ یہ قلمی استفتاء اور فتویٰ پیش کیا جا رہا ہے جس پر امام احمد رضا کے دستخط ثبت ہیں۔

امام احمد رضا عربی، فارسی اور اردو پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ البتہ انگریزی نہ جانتے تھے۔ ویسے انگریزی سیکھنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جس نے صرف ایک ماہ کے اندر قرآن حفظ کر لیا ہو اس شخص کی محیر العقول ذہانت سے یہ بعید نہ تھا کہ قلیل عرصے میں انگریزی زبان سیکھ لیتا۔ مگر حقائق اور شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا انگریزی سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ) نے انگریزی حروف و ہندسوں میں ریاضی کا ایک مسئلہ پیش کیا تھا آپ نے ان سے فرمایا۔ اردو میں لکھیں۔ اسی طرح ۱۹۱۹ء میں جب امریکن پروفیسر البرٹ الیف کی پیشگوئی پر مشتمل انگریزی اخبار ایکسپریس (بانکی پور، بھارت) کا تراشہ استفتاء کے ساتھ بھیجا گیا تو اس کا ترجمہ کرا کے جواب عنایت کیا۔ اگر انگریزی جانتے تو ترجمہ نہ کراتے۔

امام احمد رضا انگریزی حکومت و عدالت، انگریزی تہذیب و تمدن، انگریزی نظام تعلیم اور خود انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ جسکا انحصار ان کے قول و عمل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں راقم نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس میں ان حقائق و شواہد کو جمع کیا ہے۔ تحقیق کے دوران پروفیسر ابرار حسین صاحب (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری (صدر مرکزی مجلس رضا لاہور) نے ایک دستاویزی شہادت فراہم کی۔ یہ امام احمد رضا کا لکھا ہوا ایک پوسٹ کارڈ ہے جو ۱۸۹۶ء میں لکھا گیا۔ پوسٹ کارڈ پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر بنی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ امام احمد رضا نے تصویر کو الٹا کر کے پتہ لکھا ہے۔ جو وہ کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ انکے قول و عمل میں تضاد نہ تھا۔ ان کو انگریزوں سے نفرت تھی۔ اسکا اظہار ان کے عمل سے ہوتا ہے۔ جب کہ انگریزوں کے مخالفین کا عالم یہ تھا کہ ان جیسی انگریزی نہ انگریز بول سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے۔ اور ان کے ڈرائنگ روم کی شان یہ تھی کہ انگریزی تہذیب کی نشانیاں، نیم عریاں تصویریں تک لگی رہتی تھیں۔ امام احمد رضا زبانی جمع خرچ کے قائل نہ تھے۔ خود عمل کرتے اور عمل پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا ہر عمل مصلحت اندیشیوں اور جذبات سے پاک تھا۔

امام احمد رضا کے پاس برِاعظم ایشیا۔ امریکہ۔ اور افریقہ کے مختلف ممالک اور شہروں سے فتوے آتے تھے۔ ایک وقت میں چار چار سو جمع ہو جاتے تھے۔ یہ استفتاء عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں آتے تھے اور ہر استفتاء کا جواب اس زبان میں دیا جاتا تھا حتیٰ کہ منثور سوال کا منثور جواب اور منظوم سوال کا منظوم جواب لکھا جاتا تھا۔ شاید یہ خصوصیت عالم اسلام کے دوسرے دار الافتاء میں موجود نہ ہو۔ عربی اور فارسی پر تو امام احمد رضا ایسے قادر تھے جیسے اپنی مادری زبان اردو پر۔ چنانچہ ان کے ایک عربی فتوے کو دیکھ کر انہی کے عہد کے حافظ کتب الحرم

شیخ اسمٰعیل خلیل حیران رہ گئے اور ایک عربی فتوے کو پڑھ کر یہ بتایا کہ عہد کے ریاض یونیورسٹی کے (سعودی عرب) پروفیسر ابوالفتاح ابوغدہ امام احمد رضا کے غائبانہ مداح ہو گئے۔ عربی اور فارسی فتوے فتاویٰ رضویہ میں بکثرت ہیں مگر انگریزی فتووں سے ہنوز اہل علم ناآشنا ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم امام احمد رضا کے انگریزی فتوے کا عکس پیش کرتے ہیں اور مولانا محمد احمد مصباحی کے تہ دل سے ممنون ہیں۔

(اعلیحضرت کا انگریزی فتویٰ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

بھینی سہانی صبح میں ٹھنڈک جگر کی ہے
کلیاں کھلیں دلوں کی ہوا یہ کدھر کی ہے

کھبتی ہوئی نظر میں ادا کس سحر کی ہے
چبھتی ہوئی جگر میں صدا کس گجر کی ہے

ڈالیں ہری ہری ہیں تو بالیں بھری بھری
کشت امل پری ہے یہ بارش کدھر کی ہے

ہم جائیں اور قدم سے لپٹ کر حرم کہے
سونپا خدا کو تجھ کو یہ عظمت سفر کی ہے

ہم گرد کعبہ پھرتے تھے کل تک اور آج وہ
ہم پر نثار ہے یہ ارادت کدھر کی ہے

کالک جبیں کی سجدۂ در سے چھڑاؤ گے
مجھ کو بھی لے چلو یہ تمنا حجر کی ہے

ڈوبا ہوا ہے شوق میں زمزم اور آنکھ سے
جھالے برس رہے ہیں یہ حسرت کدھر کی ہے

برسا کہ جانے والوں پہ گوہر کروں نثار
ابر کرم سے عرض یہ میزاب زر کی ہے

آغوش شوق کھولے ہے جن کے لیے حطیم
وہ پھر کے دیکھتے نہیں یہ دھن کدھر کی ہے

سر سوئے روضہ جھکا پھر تجھ کو کیا
دل تھا ساجد نجدیا پھر تجھ کو کیا

بیٹھتے اٹھتے مدد کے واسطے
یا رسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا

یا غرض سے چھٹ کے محض ذکر کو
نام پاک ان کا جپا پھر تجھ کو کیا

بیخودی میں سجدۂ در یا طواف
جو کیا اچھا کیا پھر تجھ کو کیا

ان کو تملیک ملیک الملک سے
مالک عالم کہا پھر تجھ کو کیا

ان کے نام پاک پر دل، جان مال
نجدیا سب تج دیا پھر تجھ کو کیا

یٰعِبَادِی کہہ کے ہم کو شاہ نے
اپنا بندہ کر لیا پھر تجھ کو کیا

دیو کے بندوں سے کب ہے یہ خطاب
تو نہ ان کا ہے نہ تھا پھر تجھ کو کیا

لَا یَعُوْدُوْنَ آگے ہوگا بھی نہیں
تو الگ ہے دائما پھر تجھ کو کیا

دشت گرد و پیش طیبہ کا ادب
مکہ سا تھا یا سوا پھر تجھ کو کیا

نجدی مرتا ہے کہ کیوں تعظیم کی
یہ ہمارا دین تھا پھر تجھ کو کیا

تیری دوزخ سے تو کچھ چھینا نہیں
خلد میں پہنچا رضا پھر تجھ کو کیا

PHOTO COPY

Rangoon
The 14th of May 1908.

To
Moulvie Hafiz Ahmad Raza Khan Esqr
Mohalla Saudagran
Bareilly United Provinces

Honoured Sir,

We desire to place before you a certain religious matter on which we solicit your valuable opinion. The facts are briefly these. There is a Chulia Mosque in [illegible] street at this place. There are five duly elected trustees or [illegible] who manage the affairs of the said mosque according to a scheme framed by the Chief Court of Lower Burma. The trustees are given the powers of discharging the Imam, Muazzin and clerks of the mosque. In virtue of the said powers, the trustees at a meeting dis-

charged the then Imam and said trustees for irregularity, misconduct and disobedience. After the discharge, the trustees filed a suit in the chief Court of Lower Burma for a declaration that the discharge of the Imam may be confirmed. The Imam now questions the authority of the trustees and maintains however badly he may misconduct himself, they have no power to discharge him. Having placed the facts briefly we request you most humbly to give your Fatwa as to whether the trustees have the power to discharge the Imam when they find it necessary to do so. This is a vital point which is at present engaging the attention of the leading member of the Chulia Sunni Mahommedans Community and we shall thank you very much if you can send your Fatwa before the 1st week of June

Thanking you in anticipation

We beg to remain Honoured, Sir
your most obedient and humble servants

The schemes of [illegible] Muham-
madan trusteeship:
The trustees can discharge an Imam
when the Imam leaves the Sunnite
Doctrine or commits an open sin against
Sheara or there may be found in him
something which may be the cause of
abhorrence which decreases the number
of peoples at prayers or he may be dis-
obedient against the managing rules
of affairs of the mosque or assembly
of persons at prayers or there may be
something such in him; otherwise he
will not be discharged without fault.

See Raddul Mukhtar printed
Constantinople volume 3 page 577
قال في البحر واستفيد من عدم صحة عزل الناظر بلا جنحة عدمها
لصاحب وظيفة في وقف بغير جنحة وعدم اهلية

Rushidudolter لایملک القاضی التصرف فی الوقف
مع وجود ناظرہ ولو من قبلہ
Translation:— A Kazi cannot interfere a
waqf in the presence of a trustee, although
the trustee may have been fixed by
the same Kazi.

Hanafi Sharah of Ashbah printed
Lucknow page 179 copied from Fatwa
Imam Zahiruddin قاضی البلد اذا نصب رجلا متولیا
للوقف بعد ما قلدہ الحاکم الحکومۃ فلیس للحاکم علی الوقف سبیل حتی لا
Translation:— یملک الاجارۃ و لا غیرھا
A King appointed a Kazi and after it the
Kazi fixed a trustee on a waqf, now
the King has no connection with the waqf
nor has he any power of its contract &c

Another style from Lisanul Hukkam
copied from Fatwa Imam Zahri
لا تاخل ولایۃ السلطان علی ولایۃ المتولی فی الوقف
Trans:— A King cannot interfere a waqf
against a trustee's authorities.

In this case the higher officers or
Governors are not Muhammadan
ones and therefore they do not know

business which may be the cause of six months absence from the mosque, notwithstanding he may have given some person for him to act. At such opportunity the trustee can discharge him and may establish or appoint another Imam in his place.

Tahtawi printed Misr and Shami printed Constantinople volume 3 page 639

ونقيم ما لكل جواز عزله اذا مضى شهر بدي

Translation:— Allama Birjundi has said that the books aforesaid there shows that a trustee can discharge an Imam on account of a months absence from the mosque.

The trustees had no need of taking sanction of discharging the Imam from the court or from any higher officer or Governor because the authority of trustees in these matter is over the powers of a Muhammadan Governor although the same Mutawallis or trustees may have been fixed by the same Muhammadan Governor. See Ashbahunnazair printed Lucknow page 179 copied from the Fatwa of Imam

Translation: —

It is said in Bahrur Raiq that as a Mutawalli cannot be dismissed without fault, from this it is manifest that any receiver of a salary of a wage cannot be discharged until his fault be proved or he may be proved to be unfit for his duties

امر برقمه عبده المذنب احمد رضا البریلوی
عفی عنه بمحمدن المصطفی النبی الامی
صلی الله تعالی علیه وسلم

فتاوی رضویہ کے زیر طبع صفحے کا نمونہ

کتاب الوصایا

مسئلہ ۔ از مارہرہ مطہرہ مرسلہ حضرت سیدنا سید ابوالحسین احمد نوری میاں صاحب دامت برکاتہم العالیہ ۱۲۹۸ھ ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ بزرگان دین قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم العزیزہ سے ایک بزرگ نے اپنے آبائے کرام کے سجادہ نشین اور جائداد وقفیہ درگاہ و خانقاہ وقف کردہ امرائے اسلام کے متولی تھے بنام اپنے صاحبزادہ حامد اور اپنے نبیرہ احمد بن محمد کے لئے وصیت فرمائی یہ دونوں بعد میرے متولی تمام جائداد و مصارف درگاہ خانقاہ اور جملہ امور متعلقہ ریاست درگاہی و خانقاہی میں شریک مساوی رہیں اور میری جائداد مملوکہ سے احمد بن محمد نبیرہ میرا ثلث حصہ بموجب وصیت شرعیہ پائے اور اس وصیت کو ایک کاغذ پر تحریر فرمایا اور جناب ممدوح نے اپنی صاحبزادی کو اوس قدر حصہ کہ بعد وفات انہیں پہونچنا تصور کیا جاتا خواہ اس سے کم اپنی حیات میں اس شرط پر دیکر قبض و دخل کرادیا کہ اب اون کے لئے میراث میں حق نہ ہو اور یہ تخارج برضامندی اون کی واقع ہوا اور صاحبزادی صاحبہ کی طرف سے حکام کے یہاں تصدیق اس مضمون کی گذر گئی کہ میں نے اپنا حصہ پالیا اب مجھے بعد انتقال حضرت مورث کچھ دعوی ترکہ میں نہ رہا جناب ممدوح نے یہ مضمون بھی اوسی وصیت نامہ میں ذکر فرمایا آیا اس صورت میں وہ وصیت کہ حضرت موصوف نے دوبارہ تولیت فرمائی اور وصیت ثلث مال مملوک نسبت احمد بن محمد شرعاً جائز اور نافذ ہے یا نہیں اور یہ تخارج کہ حضرت ممدوح اور صاحبزادی صاحبہ میں واقع ہوا شرعاً معتبر ہے یا نہیں اگر معتبر ہو تو وصیت نامہ مذکورہ میں اس کا ذکر آجانا کل وصیت نامہ کو باطل کردیگا یا صرف اسی قدر نامعتبر اور باقی وصایائے مذکورہ صحیح اور مقبول رہیں گے اسی طرح اوس کاغذ میں یہ بھی ذکر فرمایا تھا کہ بعد میرے اگر اہل خانہ میری زندہ رہیں تو خبر گیری اونکی جائداد اور احمد بن محمد بقدر معتدبہ کرتے رہیں یہ امر اون دونوں کے ذمہ ہے مگر بی بی صاحبہ مورث کے سامنے ہی گذر گئیں آیا یہ کلمات بھی کچھ منافی صحت وصایائے مذکورہ ہیں یا نہیں اور بی بی صاحبہ اگر بعد کو زندہ رہتیں تو عام اس سے کہ یہ فقرہ اونکی رضا سے تحریر ہے یا بے رضا بہر تقدیر وہ اس تحریر کی بنا پر

سُنیوں کو مژدۂ جانفزاء

یادگارِ اعلیحضرت

امامِ اہلسنّت مجدّدِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا خانصاحب علیہ الرحمۃ

جامعہ رضویہ منظرِ اسلام اور سُنّی رضوی جامع مسجد

کی تعمیر کے سلسلہ بہت جلد

گلشنِ اقبال بلاک کے پلاٹ ST.3 اور ST.3/A کراچی پر شروع ہو رہا ہے

وقت اور تاریخ افتتاح کا اعلان عنقریب کیا جائے گا

زیرِ اہتمام

سُنی رضوی سوسائٹی ٹرسٹ

بانی و منیجنگ ٹرسٹی مولانا محمد ابراہیم خوشتر صدیقی قادری

المشتہر

قائم مقام منیجنگ ٹرسٹی شفیع محمد قادری رضوی حامدی

قادریہ منزل 3/3-J-II ناظم آباد کراچی . فون ۶۱۴۶۵۱

(اوکھائی پریس نزد اُردو بازار کراچی ۔ فون ۲۱۴۴۵۳)